www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2018 ، قیمت :-/10₹

ماھنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

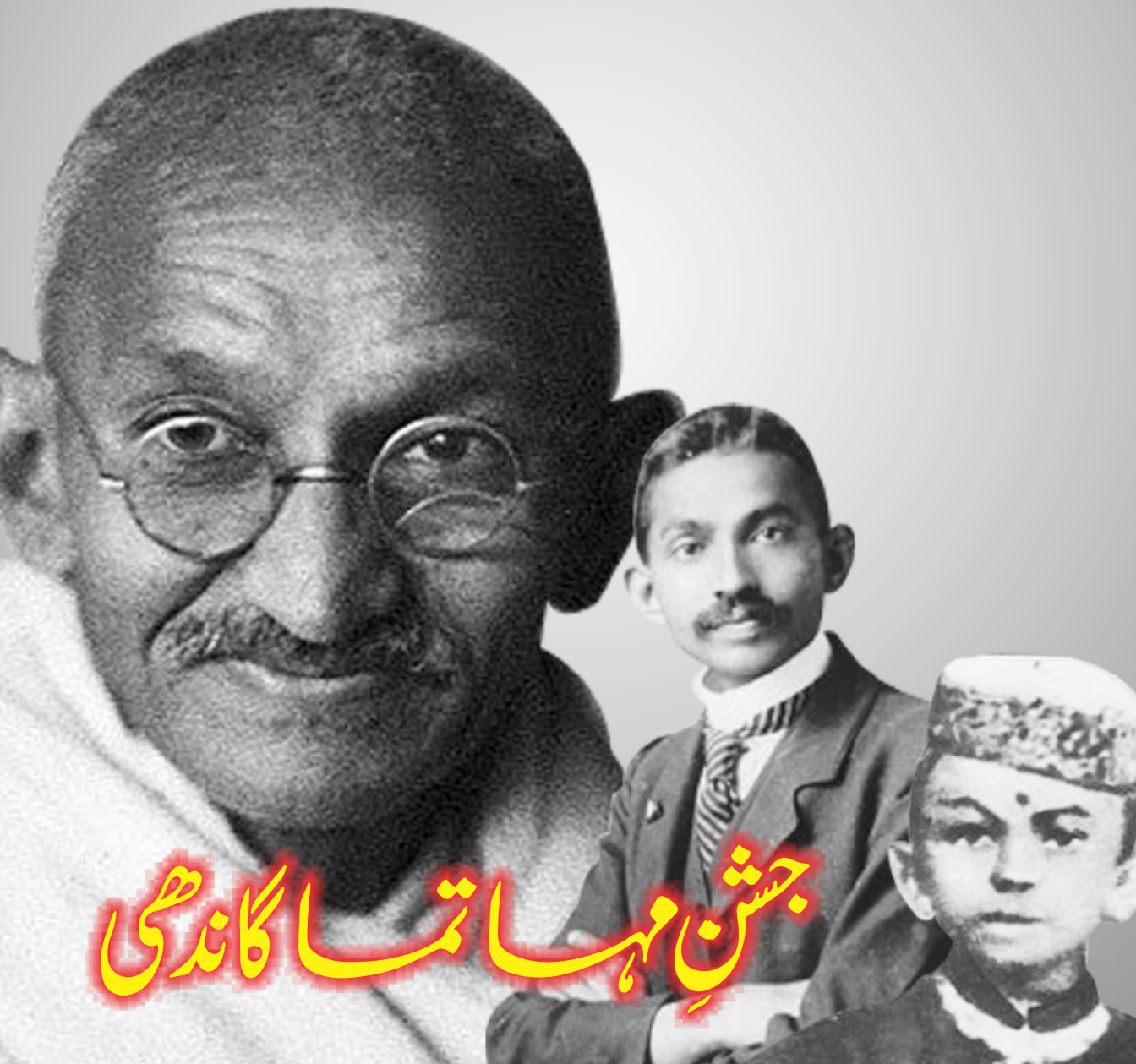

جشنِ مہاتما گاندھی

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اورعام اردوقاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہرشمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

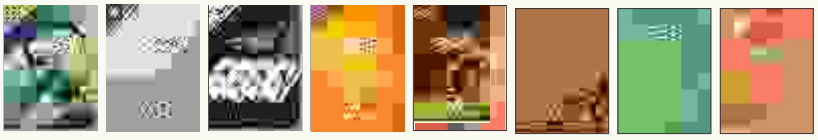

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 6 شمارہ: 10 اکتوبر 2018

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000

شعبہ ادارت:11-49539009

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ/100 روپے

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی-110066

فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

اس شمارے میں

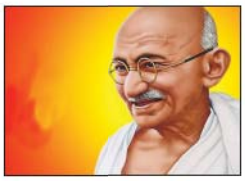

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05

جشنِ مہاتما گاندھی

	گاندھی جی کا بچپن	راجگاری شنکر، مترجم: نامی انصاری	07
	گاندھی جی کا چشمہ	راحت مظاہری	09
	گاندھی جی کی عظمت	فرحت اللہ انصاری	10
	گاندھی جی کا خواب	ابواللیث جاوید	13
	گاندھی جی افریقہ میں	راجگاری شنکر، مترجم: نامی انصاری	14
	مہاتما گاندھی کے لیے	ساحر داؤدنگری	18
	بابائے قوم مہاتما گاندھی	خلیق الزماں نصرت	19
	گاندھی جی: سچائی، عدم تشدد.....	محمد شمیم اختر	21
	صفائی کا تحفہ	محمد انیس الرحمن خان	24
	گاندھی جی	زیبا ناز	27
	دھرم کی جھلک	مہاتما گاندھی	29
	تین اقرار	مہاتما گاندھی	30
نظم	ماں کی عظمت	مہناز بانو	31
کھیل اور کھلاڑی	فٹ بال ورلڈ کپ 2018	ملک بزمی	32
	یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ...	فرح دیبا	35
کہانی	نافرمانی کی سزا	غوثیہ سعیدہ	38
باتصویر کہانی	پیڑ پیڑ میرا دانہ دے	سید غلام حیدر	40
قسط وار ناول	شہر میں ایک جنگل	کمارن ست سیوم	45
کہکشاں	گھر واپسی	نوید اختر پروانہ برہانپوری	51
	ہندکی بیٹی: متانگینی ہاجرہ	فیاض احمد	52
	ہماری ٹیچر	شمائلہ تنزیل	53
	ہنسی کے غبارے		55
ننھے فنکار	انصاف کی پکار	عائشہ آفرین عبدالرؤف	56
	مینڈک کی دنیا	محمد تنویر	59
	بچوں کی پینٹنگ		60
آپ کی باتیں	فیس بک		62

آپس کی باتیں

پیارے دوستو! اکتوبر کا شمارہ حاضر ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ اکتوبر گاندھی جی کی ولادت کا مہینہ ہے۔ اگلے سال مہاتما گاندھی کی پیدائش کے 150 سال پورے ہورہے ہیں۔ پورے دو برس تک ملک کے مختلف حصوں میں گاندھی جی کے متعلق تقریبات کا انعقاد کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں حکومت نے باضابطہ ایک کمیٹی بھی بنائی ہے۔ وزیراعظم نریندر مودی نے بھی اعلان کیا ہے کہ گاندھی جی کے 150 ویں یومِ پیدائش کو عالمی سطح پر منایا جائے گا۔

دوستو! آپ سب کو پتہ ہوگا کہ گاندھی جی نے ہمارے ملک کے لیے کتنی قربانیاں دی ہیں۔ بچپن سے لے کر اپنی زندگی کی آخری سانس تک وہ اہنسا کے فلسفے پر قائم رہے۔ وہ جسمانی طور پر دبلے پتلے اور کمزور تھے لیکن ان کا جذبہ اور حوصلہ بہت مضبوط تھا، اپنی خود اعتمادی اور مضبوط قوت ارادی کی وجہ سے سیکڑوں انسانوں پر بھاری تھے۔ آج ساری دنیا میں مہاتما گاندھی کو جو عزت، وقار اور مرتبہ دیا جاتا ہے وہ گاندھی جی کی اہنسا کے لیے کی گئی کوششوں کی وجہ سے ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب انگریز غریب لاچار اور بے بس عوام پر ظلم کرتے تھے۔ گاندھی جی نے نفرت کا جواب محبت سے دیا اور یہی کہا کہ ظالم کا بدلہ ظلم سے نہیں لیا جاسکتا۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی پر ہمیشہ زور دیا اور کہا کہ ہمارا ملک تبھی ترقی کرے گا جب ہم ایک ہوں گے۔ جنوبی افریقہ میں اپنے قیام کے دوران انھیں کتنی مشکلات جھیلنی پڑیں یہاں تک کہ انھیں ٹرین سے نیچے پھینک دیا گیا لیکن گاندھی جی نے ہار نہیں مانی اور رنگ و نسل کے بھید بھاؤ کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ہمارے ملک کے علاوہ دیگر ممالک میں ایزل بلیر جونیئر (جبریل خزان)، مارٹن لوتھر کنگ، البرٹ آئنسٹائن، نیلسن منڈیلا، دلائی لامہ، الگورے، رچرڈ اٹین برو، ول ڈورانٹ، جارج برنارڈ شا جیسے عظیم لوگ بھی گاندھی جی سے بے حد متاثر رہے ہیں اور انھوں نے گاندھی جی کے اصولوں کی حمایت کی ہے۔ مارٹن لوتھر کنگ نے کہا تھا:

''میں گاندھی جی کے فلسفے کا جتنا گہرا مطالعہ کرتا گیا اتنا ہی میرے ذہن سے محبت کی طاقت کے بارے میں اندیشہ کم ہوتا گیا اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ عیسائی مذہب میں محبت کے جس اصول پر زور دیا گیا ہے اس پر اگر اہنسا کے گاندھیائی ڈھنگ سے چلا جائے تو مصیبت زدہ کمزور لوگوں کے لیے اپنی لڑائی میں محبت کی یہ طاقت بہت کارگر ہتھیار ثابت ہوگی۔

مارٹن لوتھر کنگ نے امریکہ میں گاندھی کے فلسفے کو اپنا کر عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور ساری دنیا میں یہ پیغام دیا کہ گاندھی کے اصول ہمیشہ درست تھے اور آنے والے دنوں میں بھی درست رہیں گے۔

پیارے بچو! گاندھی جی صفائی ستھرائی پر بہت زیادہ توجہ دیتے تھے اور اسی لیے ہمارے وزیراعظم نریندر مودی نے 2/اکتوبر 2014 کو سوچھ بھارت مشن شروع کیا تھا۔ اس مشن کے تحت ہمیں 2/اکتوبر 2019 تک پورے ملک میں صاف صفائی کو یقینی بنانا ہے تاکہ گاندھی جی کے 150 ویں یوم پیدائش پر انھیں ایک صاف ستھرے ہندوستان کا تحفہ پیش کیا جاسکے۔ آپ سب بھی اپنے آس پاس صاف صفائی کا خصوصی دھیان رکھیں۔ صفائی ستھرائی صحت کے نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے اور اس سے بیماریاں دور رہتی ہیں۔

گاندھی جی کے 150 ویں یومِ پیدائش کی مناسبت سے اس شمارے میں گاندھی جی کی شخصیت اور زندگی کے متعلق مضامین شامل ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر کالموں کے تحت کہانیاں، نظمیں بھی آپ کو پسند آئیں گی۔ 'بچوں کی دنیا' آپ پڑھیں اور اپنے تاثرات سے نوازیں۔ آپ کے مشوروں کا ہمیں انتظار رہے گا۔

آپ کا

مرتضیٰ

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈاک خانہ

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (نئی دہلی) نے اردو صحافت کے میدان میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس کا سہرا قومی اردو کونسل کے لائق ڈائرکٹر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کے سر جاتا ہے۔ بین الاقوامی سطح کے دو معیاری اور مقبول جرائد 'فکر و تحقیق' اور 'اردو دنیا' کی اشاعت کے بعد ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کے اجرا نے اردو صحافت کو بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اردو میں اس معیار اور اس نئے نویلے انداز کے رسالے جو جاذبِ نظر بھی ہوں، عہدِ حاضر میں دنیا کے کسی اور گوشے سے اشاعت پذیر نہیں ہوتے۔ ان رسائل کے مدیر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم اور نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہی کی محنت اور لگن، نیز صحافتی سوجھ بوجھ کی وجہ سے یہ رسائل پوری اردو دنیا کی توجہ کا مرکز بن چکے ہیں۔ ان رسائل کی نہ صرف خوبصورتی اور دلکشی قابلِ دیدنی ہے، ترتیب وتہذیب اور مواد کے انتخاب کے اعتبار سے بھی یہ اعلیٰ پائے کے رسائل ہیں۔

فی الوقت ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کا جولائی 2018 کا شمارہ بدست ہے جس کے مشمولات میں بچوں کی دلچسپی کے ہلکے پھلکے مضامین، مزیدار کہانیاں، اور خوبصورت و رواں نظمیں ہیں۔ علاوہ ازیں کھیل اور کھلاڑی کے کالم میں عالمی فٹ بال 2018 کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ خصوصی کالم میں فیس بک، کہکشاں اور ننھے فنکار کے تحت بچوں کی دلچسپی کا سامان مہیا کیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ نئے لکھنے والوں کی تحریروں کے ساتھ مرزا حامد بیگ، محسن خاں اور ابرار اعظمی جیسے سینئر لکھنے والوں کی نگارشات بھی اس میں شامل ہیں جن میں بچوں کی نفسیات، ذہنی استعداد اور دلچسپی کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ ان سب سے قطع نظر، مدیرِ رسالہ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کا اداریہ 'آپس کی باتیں' بھی نہایت خوب ہے جس میں انھوں نے باتوں ہی باتوں میں، اور نہایت آسان زبان میں بعض مفید سائنسی اور ماحولیاتی باتیں بتادی ہیں جن کے تئیں بچوں کی بھی بیداری لازمی ہے۔ میں اس رسالے کی درازیِ عمر کے لیے دست بہ دعا ہوں۔

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ، وبھوتی کھنڈ گومتی نگر، لکھنؤ، اتر پردیش

'بچوں کی دنیا' ایک نہایت معیاری ماہانہ مجلّہ ہے۔ اس کی ترتیب اور ڈیزائن بچوں کی فکری ساخت اور ان کے ذہنی رجحان کے مطابق ہے۔ مختلف خوش رنگ تصاویر نے جہاں مجلّے میں بچوں کے لیے فطری دلچسپی کے امکانات فراہم کردیے ہیں وہیں موضوع سے مطابقت رکھتے ہوئے فوٹو گراف بچوں کے معصوم ذہنوں کو مشکل موضوعات اور مواد کے سمجھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

موضوعات کے اعتبار سے مجلّے میں زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق اہم معلوماتی مضامین شامل کرکے اس مجلّے کی نہ صرف یہ کہ علمی اور ادبی حیثیت کو بلند کردیا گیا ہے بلکہ زندگی اور فطرت

سے ماخوذ مواد کو اصلاحی انداز میں اس قدر دلچسپ طریقے سے پیش کیا جاتا ہے کہ بچوں کی عام معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ زندگی کی اعلیٰ اقدار سے بھی انھیں روشناس کرایا جائے اور اس طرح یہ مجلّہ علم بردوش ذہن سازی اور تہذیب زندگی کے فرائض بھی نہایت احسن طریقے سے ادا کر رہا ہے۔

جنرل نالج، کھیل، طب، سائنس، تاریخ، معاشرت اور زبان و ادب تمام جہتوں کا احاطہ یہ رسالہ کرتا ہے اور اس اعتبار سے بے حد دلچسپ ہے کہ اس مجلّے میں بچوں کی فکری سطح اور ان کی نظر سے دنیا کو دیکھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نظمیں اور کہانیاں نہایت دلچسپ اور باحکمت ہیں۔ یہ بھی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ مغربی ناولوں کے ترجمے بھی اس میگزین میں شامل ہیں۔ بچوں کی نگارشات اور تصویری پہیلیوں کی شمولیت نے مجلّے کے حوالے سے بچوں کی عملی سرگرمی کو فروغ دیا ہے۔ بچوں کے ذریعے بنائی ہوئی دلکش اور معصوم تصویروں کو دیکھ کر بے اختیار پیار آجاتا ہے۔ تمام جریدوں کی طرح 'اردو فیس بک' کے نام سے اس جریدے میں خط و کتابت کا بھی ایک سلسلہ رکھا گیا ہے جس کے حوالے سے بچے اپنی آرا اور خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

میری نگاہ میں زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جس پر مجلّہ کی گرفت نہ ہو۔ البتہ کامک کی طرز پر ایک دو کہانیاں بھی اگر اس مجلّے میں شامل کردی جائیں اور کارٹون کے ذریعے دلچسپ حقائق اور لطیفے بھی پیش کیے جائیں تو بہتر ہو نیز روحانی اور دینی رہنماؤں کے حوالے سے معلوماتی مضامین بھی شامل کیے جائیں جو تمام مذاہب کا احاطہ کریں۔

ڈاکٹر فرحت نادر رضوی، E-246/1، ابوالفضل انکلیو، پارٹ 2، نئی دہلی

ماہ جولائی کا 'بچوں کی دنیا' موصول ہوا۔ اِس شمارے کے مشمولات نے مکمل شمارہ پڑھنے کی طرف مائل کیا۔ پروفیسر مرزا حامد بیگ، رؤف صادق، عبدالمتین جامی اور فرزانہ اسلم کے قصے کہانیوں کا تناظر نیا ہے۔ ان میں کہانی کاروں نے بچوں کی تعمیری اور تشکیلی تربیت احسن انداز سے کی ہے۔ رؤف صادق (ممبئی) ایک خوش بیان شاعر ہیں۔ لیکن انھوں نے 'جوہی کی مالا' جیسی کہانی لکھ کر طفلی ادب کو گراں قدر بنا دیا ہے۔

شعیب عالم قاسمی نے سوشل میڈیا کا ایک ستون ٹیلی گرام ایپ کے بارے میں بہت عمدہ اور معلومات افزا مضمون تحریر کیا ہے۔ اِس مضمون کو سوشل میڈیا کے صارفین کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ شمس الاسلام فاروقی، احرار حسین اور محسن رضا کے مضامین بے حد معلوماتی ہیں۔ ابرار اعظمی، جاوید مجیدی، ستار فیضی، قیوم اثر کی منظومات لائق مطالعہ ہیں۔ 'بچوں کی دنیا' کا یہ شمارہ بچوں کی ڈھیر ساری سوغات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اگر ممکن ہو تو اسلاف کی یادگار تحریروں کے ایک کالم کا آغاز کیا جائے۔ جیسا کہ مائل خیرآبادی، اسماعیل میرٹھی وغیرہم کی نگارشات شائع کی جائیں۔

ڈاکٹر غضنفر اقبال، گلبرگہ (کرناٹک)

بچوں کا ادب تخلیق کرنے کے لیے بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھا جائے تو تخلیقات کی کامیابی لازم ہوگی۔ ان کی ذہنی سطح کے مطابق ہی تخلیقات شائع کی جائیں۔ اس ضمن میں آپ کا ادارہ خاص دھیان دیتا ہے۔ 'بچوں کی دنیا' کافی تعداد میں اردو والوں کے گھروں تک پہنچ رہا ہے۔ یہ اردو والوں کی خوش نصیبی ہے کہ انگریزی کے رسالوں سے بھی بہتر رسالہ اتنی کم قیمت میں حاصل ہو رہا ہے۔ کم عمری سے ہی بچوں کا ذہن اردو کی طرف مائل کرانے کی سعی کرتے رہنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسری زبانوں کے مقابلے اردو میں زیادہ کشش ہے کیونکہ یہ عام بول چال کی زبان ہے...''

سحر نسیم بانو، 862، شانتی نگر، صلاح الدین ایوبی کے سامنے، بھیونڈی، مہاراشٹر

راجکماری شنکر، مترجم: نامی انصاری

گاندھی جی کا بچپن

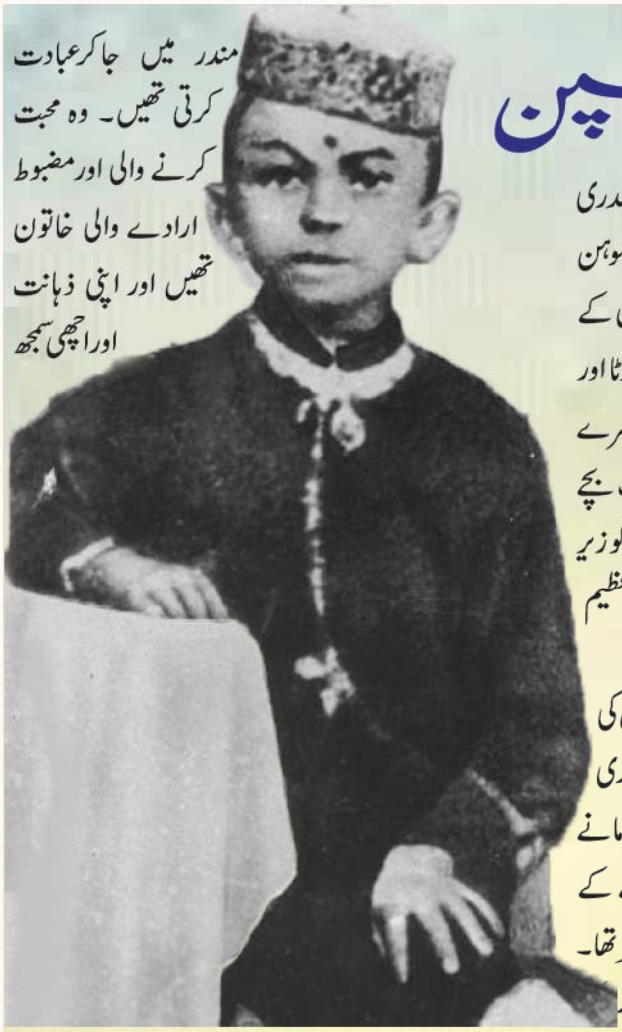

مغربی ہندوستان کے پور بندر شہر میں کاٹھیاواڑ کے سمندری کنارے پر واقع ایک چھوٹے اور صاف ستھرے گھر میں موہن داس کرم چند گاندھی 2/اکتوبر 1869 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کرم چند گاندھی اور والدہ پتلی بائی تھیں۔ ان کا قد چھوٹا اور رنگ سانولا تھا اور وہ ہندوستان میں پیدا ہونے والے دوسرے لاکھوں بچوں سے مختلف نظر نہیں آتے تھے۔ پھر بھی وہ ایک بچے نہیں تھے۔ انھیں بغیر ہتھیار اٹھائے ایک بڑی سلطنت کو زیر کر کے اپنے ملک کو آزاد کرانا تھا۔ ان کو مہاتما اور ایک عظیم انسان کہلانا تھا۔

انھیں عوام کو آزادی دلانے میں رہبری کر کے انھیں کی خاطر اپنی زندگی وقف کرنی تھی۔ پور بندر ایک پرانا سمندری بندرگاہ ہے جو باردا پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ قدیم زمانے میں بھی جہاز دور دراز علاقوں سے وہاں تجارت کرنے کے لیے آتے جاتے تھے۔ یہ گاندھی خاندان کا آبائی گھر تھا۔ موہن داس کے دادا اور والد اپنی قابلیت اور اچھے کردار کے لیے مشہور تھے۔

دادا اُتّم چند گاندھی نرم مزاج کے تاجر خاندان سے تھے جو پور بندر کے دیوان بن گئے تھے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے کرم چند گاندھی جو کابا گاندھی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس عہدے پر مقرر ہوئے۔ کرم چند گاندھی نے اسکولی تعلیم برائے نام حاصل کی مگر ان کے علم اور تجربے نے انھیں ایک اچھا منتظم بنا دیا۔ وہ بہادر اور مہربان تھے۔

کرم چند کی اہلیہ پتلی بائی کٹر مذہبی خاتون تھیں۔ وہ روز مندر میں جا کر عبادت کرتی تھیں۔ وہ محبت کرنے والی اور مضبوط ارادے والی خاتون تھیں اور اپنی ذہانت اور اچھی سمجھ

تھے۔ موہن داس، کابا گاندھی کے چھ بچوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ وہ خاندان کے چہیتے بچے تھے اور ان کے چاہنے والے والدین اور دوست انھیں مونیا کے نام سے پکارتے تھے۔ مونیا اپنی ماں کو بہت چاہتے تھے۔ وہ والد کو بھی بہت چاہتے تھے مگر وہ ان سے کچھ ڈرتے بھی تھے۔

بچپن میں مونیا ہی گھر پر کم رہنا پسند کرتے تھے۔ وہ گھر کھانا کھانے جاتے اور فوراً ہی واپس آ کر باہر کھیلنے لگتے۔ اگر ان کا کوئی بھائی انھیں چھیڑتا یا شرارت سے ان کے کانوں کو

کھینچتا تو وہ اس کی شکایت ماں سے کرنے کے لیے گھر دوڑ جاتے تھے۔

ماں پوچھتیں ''تم نے اسے مارا کیوں نہیں؟''

''ماں جی! تم مجھے دوسرے لوگوں کو مارنے کی تعلیم کیسے دے سکتی ہو؟

میں اپنے بھائی کو کیوں ماروں؟ میں کسی کو کیوں ماروں؟''

مونیا کا فوراً جواب ہوتا۔

ان کی ماں اپنے لڑکے کے ان خیالات سے حیرت زدہ ہوجاتی تھیں کہ میرے چھوٹے بچے کے پاس یہ خیالات کہاں سے آئے؟

مونیا صرف سات ہی سال کا تھا جب اس کے والد نے پور بندر چھوڑ دیا اور وہ راج کوٹ کے دیوان بن گئے۔ مونیا، پور بندر سے دور ہوگیا۔ راج کوٹ میں اسے پرائمری اسکول میں بھیجا گیا۔ وہ شرمیلا تھا اور دوسرے بچوں سے آسانی سے گھل مل نہیں پاتا تھا۔ ہر صبح وہ اسکول وقت سے جاتا اور اسکول ختم ہوتے ہی واپس گھر لوٹ آتا تھا۔ اس کی کتابیں ہی اس کی ساتھی تھیں اور وہ اپنا خالی وقت پڑھنے میں گزار دیتا تھا۔

اس کا ایک ہی دوست تھا جس کا نام اُکا (Uka) تھا۔ اُکا خاکروب اور اچھوت تھا۔ ایک دن مونیا کو کچھ مٹھائیاں ملیں۔ وہ فوراً انھیں اکا کو دینے کے لیے پہنچ گیا۔

اُکا نے کہا ''کہ میرے قریب نہ آؤ۔'' چھوٹے مالک۔

کیوں نہیں؟ مونیا نے تعجب سے پوچھا۔

''کیوں میں تمہارے پاس نہیں آسکتا؟''

''میں ایک اچھوت ہوں مالک۔'' اُکا نے جواب دیا۔

مونیا نے اُکا کے ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے انھیں مٹھائیوں سے بھر دیا۔ اس کی ماں نے کھڑکی سے یہ سب دیکھا اور مونیا کو فوراً اندر آنے کا حکم دیا۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ ایک اعلیٰ ہندو قوم والا ایک اچھوت کو نہیں چھوسکتا۔'' انھوں نے سختی سے پوچھا۔

''مگر کیوں نہیں ماں؟'' مونیا نے پوچھا۔

''کیونکہ ہمارے ہندو رواج اس کی اجازت نہیں دیتے۔'' انھوں نے کہا۔

''میں آپ سے اتفاق نہیں رکھتا ماں جی۔ میں اُکا کو چھونے میں کوئی غلطی محسوس نہیں کرتا۔ وہ مجھ سے مختلف نہیں ہے نا؟''

اس کی ماں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

انھوں نے غصے سے کہا کہ جاؤ اور غسل کرکے پوجا کرو۔''

کرم چند گاندھی اپنے سبھی لڑکوں کو چاہتے تھے لیکن سب سے چھوٹے لڑکے کو کچھ زیادہ ہی پیار کرتے تھے۔ وہ اکثر اس سے کہتے تھے۔

''تمھیں اسکول اور کالج جاکر کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔''

مونیا نے سخت محنت کی اور اپنے سبق غور سے پڑھے مگر وہ کوئی سبق رٹنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لیے سنسکرت میں وہ کمزور رہا۔ جیومیٹری کو وہ سب سے زیادہ پسند کرتا تھا کیونکہ اس میں عقلی دلائل زیادہ تھے۔

ایک بار مونیا نے شرَوَن (Sharvana) کی کہانی پڑھی۔ شَروَن کے والدین بوڑھے اور اندھے تھے اور وہ ہمیشہ انھیں اپنے کندھوں پر دو بھی بگھیوں میں بٹھا کر لے جاتا تھا۔ مونیا، شرون کے والدین کے لیے اس خدمت سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے عہد کیا کہ ''میں بھی شرون کی طرح بنوں گا۔''

انھیں دنوں اس نے ایک ڈرامہ بھی دیکھا جو راجہ ہریش

چندر سے متعلق تھا جو اپنی سچائی اور حق گوئی کے لیے مشہور تھا۔
اور وہ خود سے کہنے لگا ''کیوں نہ ہم سب بھی ہریش چندر کی طرح سچے انسان بنیں؟'

موہن جب تیرہ ہی سال کے تھے تب ان سے کہا گیا کہ ان کی شادی جلد ہی ہونی ہے۔ ان کے والدین نے ان کے لیے پہلے سے ہی بہو کا انتخاب کرلیا تھا۔ وہ پور بندر میں رہتی تھی اور اس کا نام کستور بائی تھا۔ وہ اور موہن داس تقریباً ایک ہی عمر کے تھے۔ شادی کا دن آ پہنچا۔ موہن داس نئے کپڑے پہنے تھے۔ ہر ایک رنگین لباس میں نظر آ رہا تھا اور گھر پھولوں اور کیلوں کے پتوں سے سجا تھا۔ دولہا بارات کے ساتھ پور بندر کے لیے روانہ ہوا۔

دولہن کے گھر بھی بڑی سجاوٹ اور رونق تھی۔ وہاں گانا بجانا اور ناچ ہو رہا تھا۔ نیک ساعت میں دولہا اور باراتی پہنچ گئے۔

کستور بائی لال ساڑی میں اور قیمتی زیورات پہنے شرمائی سی دلکش نظر آ رہی تھی۔ خوشی اور مسرت کے ماحول میں موہن داس کی شادی کستور بائی سے ہوگئی۔ یہ جشن ہفتے بھر چلتے رہے اور تب دولہن پور بندر کے اپنے گھر سے رخصت ہوکر اپنے شوہر کے گھر راج کوٹ چلی گئی۔

کستور بائی خوب صورت اور زندہ دل لڑکی تھی۔ موہن داس اور وہ اکثر ساتھ کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی موہن داس اپنی بیوی کو پڑھانے کی بھی کوشش کرتا تھا مگر وہ کتابوں میں دل چسپی نہیں لیتی تھی۔ جبکہ اس نے گھریلو کاموں کو جلد ہی سیکھ لیا تھا۔

■

ماخذ: گاندھی کی کہانی، **مصنف:** راجکماری شنکر، **مترجم:** نامی انصاری، **ناشران:** چلڈرن بک ٹرسٹ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، بچوں کا ادبی ٹرسٹ

جشنِ مہاتما گاندھی

گاندھی جی کا چشمہ

پیار بھرا، اک نغمہ دے دو
گاندھی جی کا چشمہ دے دو
دیکھوں اُس سے سب کو یکساں
ایک برابر سارے انساں
ہوتے کیوں ہیں خونی جھگڑے؟
موٹو ہے پتلو کو پکڑے
پیار بھرا، اک نغمہ دے دو
گاندھی جی کا چشمہ دے دو
مسجد، مندر کا بٹوارہ
اک دوجے کا ہے ہتیارا
ہوتی کیوں ہے خونی ہولی؟
جل گئی پھر مفلس کی کھولی
کیسے ہوگا اب نرمان
سکتے میں ہے میری جان
پیار بھرا، اک نغمہ دے دو
گاندھی جی کا چشمہ دے دو

■

Dr. Rahat Husain
172-A, St. No: 5, Ambedkar basti
Maujpur, Delhi - 110053
Mob: 9891562005

فرحت اللہ انصاری

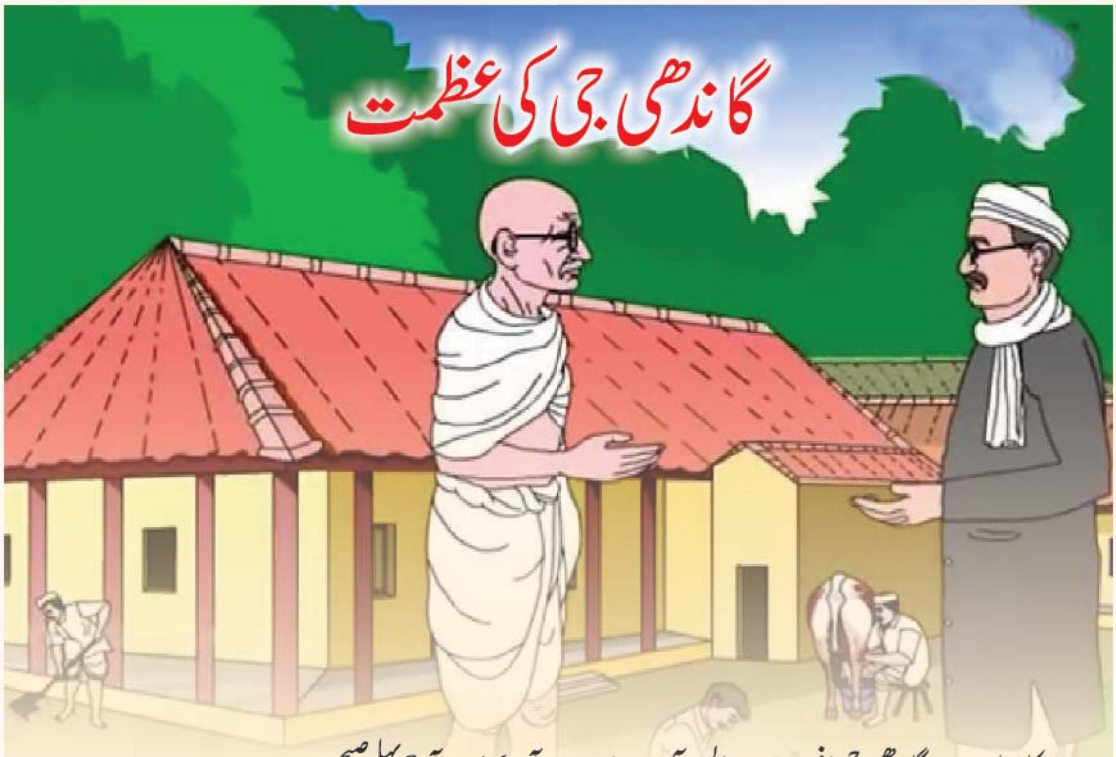

گاندھی جی کی عظمت

1915 کا زمانہ ہے۔ گاندھی جی افریقہ سے واپس آرہے ہیں، بمبئی کی بندرگاہ پر اخبار نویسوں کا اچھا خاصا مجمع ہے۔ ایک پارسی نوجوان جھپک کر آگے بڑھتا ہے۔ اس خیال سے کہ سب سے پہلے وہی گاندھی جی سے بات کرے۔ حسبِ دستور اس نے انگریزی میں سوال کیا۔ گاندھی جی نے سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے نرم و نازک لہجے میں کہا:

''آپ بھی ہندوستانی، میں بھی ہندوستانی۔ میری مادری زبان بھی گجراتی، آپ کی مادری زبان بھی گجراتی۔ پھر آپ مجھ سے انگریزی میں سوال کیوں کرتے ہیں؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں جنوبی افریقہ میں رہ کر اپنی مادری زبان بھول گیا ہوں؟''

گاندھی جی شانتی نکیتن میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ کل ہی آئے ہیں۔ آج پہلی صبح ہے۔

شانتی نکیتن کے لوگ جن میں اس زمانے میں کاکا کلیلکر بھی ہیں حسب معمول کام پر چلے جاتے ہیں۔ کام یہ ہے کہ شانتی نکیتن کی کیٹوں کے سامنے ایک تالاب ہے جسے وہ ہر صبح پاس کے ٹیلہ کو کھود کر پاٹتے ہیں۔ ایک گھنٹہ کی اس مشقت کے بعد جب پلٹتے ہیں تو ناشتہ تیار کرتے ہیں، کھاتے ہیں۔ پھر دوسرے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔

آج جو یہ ٹولی پلٹی تو کیا دیکھتی ہے کہ پھل پھلاری سب قاعدہ سے کٹی بنی تھالیوں میں لگی ہوئی ہیں۔

کاکا نے مہاتما گاندھی جی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

''آئیں! یہ سب آپ نے کیا ہے؟''

مہاتما جی نے جواب دیا ''میں نے۔''

کاکا: ''آپ نے! یہ تو کچھ اچھا نہیں لگتا کہ آپ یہ سب کریں

اور ہم لوگ بیٹھ کر کھائیں۔''

مہاتما: ''اس میں حرج ہی کیا ہے۔ تم کام پر گئے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا اتنی دیر میں، میں تمہارا ناشتہ تیار کر دوں۔''

بمبئی 1915 کی کانگریس ہو رہی ہے۔ گاندھی جی ماروا ڑی ودیالیہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک دن ان کو کہیں باہر جانا تھا۔ انھوں نے اپنے ڈیسک کی چیزوں کو سلیقہ سے سمیٹنا شروع کر دیا۔ سب چیزیں رکھ لینے کے بعد بھی وہ کسی چیز کو بڑے دھیان سے ادھر اُدھر ڈھونڈنے لگے۔ کاکا کلیلکر نے پوچھا:

''باپو! آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟''

''باپو: ''ایک پنسل ڈھونڈ رہا ہوں۔ ننھی سی ہے۔''

کاکا: ''لیجیے آپ یہ پنسل رکھ لیجیے۔ میں اس پنسل کو ڈھونڈ کر رکھ لوں گا۔'' مقصد یہ تھا کہ باپو کا قیمتی وقت کیوں ضائع ہو، اور وہ بلاوجہ کیوں تھکیں۔''

''باپو: 'نہیں، مجھے وہی پنسل چاہیے۔ وہ مجھے ایک چھوٹے سے بچے نے دی تھی۔ میں اسے کھو نہیں سکتا۔''

کاکا بھی باپو کے ساتھ ڈھونڈنے میں لگ گئے اور جب تک اس ننھے بچے کا وہ ننھا سا تحفہ مل نہیں گیا، باپو کو چین نہیں آیا۔

گاندھی جی نے گجرات میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جب گجراتیوں کو معلوم ہوا کہ گاندھی جی لسانی صوبوں کی تشکیل پسند کرتے ہیں تو کچھ لوگوں کو ''گجرات راجکیہ پریشد'' (گجرات پولیٹیکل کانفرنس) قائم کرنے کی سوجھی۔

گاندھی جی ٹھیک وقت پر کانفرنس پہنچ گئے۔

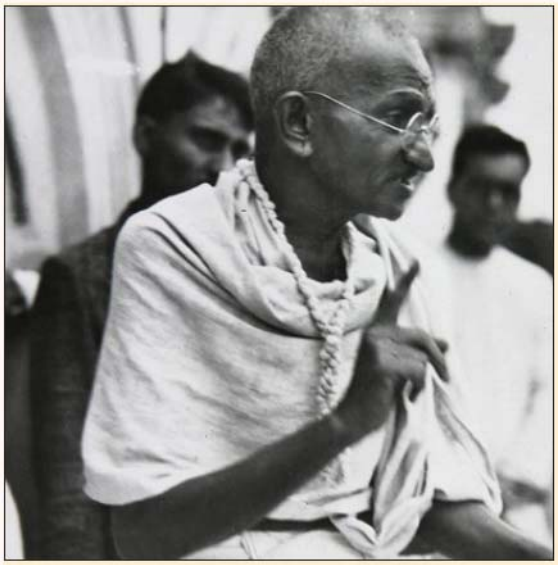

مہاراج تلک بھی مدعو تھے۔ وہ جیسا کہ اکثر ہوا کرتا تھا، آدھ گھنٹہ دیر سے پہنچے۔

گاندھی جی نے ان کا بڑے تپاک اور احترام سے خیر مقدم کیا مگر کہا:

''لوک مانیہ آدھ گھنٹہ دیر سے آئے ہیں۔ اگر ہمیں سوراج لینے میں آدھ گھنٹہ اور لگا تو اس کا عذاب لوک مانیہ کے سر رہے گا۔''

1930 کا زمانہ ہے۔ گاندھی جی پرودا جیل میں ہیں۔ میجر مارٹن جیل سپرنٹنڈنٹ گاندھی جی کے لیے فرنیچر اور برتن وغیرہ کا انتظام کر رہے ہیں۔ جب یہ چیزیں گاندھی جی کے پاس پہنچنا شروع ہوتی ہیں تو گاندھی جی جیل سپرنٹنڈنٹ سے کہتے ہیں:

''یہ سب کس کے لیے آ رہا ہے؟''

جیل سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا: ''آپ کے لیے۔ میں نے گورنمنٹ کو لکھا ہے کہ اتنے بڑے معزز مہمان کے خورد و

نوش کے لیے تین سو روپے مہینے کا انتظام ہونا چاہیے اور مجھے امید ہے گورنمنٹ اسے بھی منظور کرلے گی۔''

گاندھی جی نے کہا: ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مگر میرا ماہانہ خرچ 35 روپے سے زیادہ نہ ہوگا۔ مجھے اس سب سامان کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میری صحت ٹھیک ہوتی تو میں کھانا بھی 'سی' کلاس کا کھاتا۔ اس لیے مہربانی کرکے یہ سب لوازات ختم کیجیے۔''

ساری کراکری واپس ہوگئی اور اس کی جگہ وہی تسلا اور چمبو گاندھی جی کے لیے بھی آ گیا۔

شنکر لال جی کا کہنا ہے کہ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ میں جیوت رام کرپلانی اور عمر سبحانی نے ہوم رول کا بڑا کام کیا ہے اور بمبئی کی ساری سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔

ایک دن ہم نے سنا کہ ایک آدمی گاندھی ہندوستان آیا ہے جو بہت کچھ کرنے والا ہے۔ خیال ہوا کہ چلو اس سے ملیں اور دیکھیں کہ اس سے کہاں تک کام لیا جاسکتا ہے۔ ہم لوگ گئے۔ گاندھی جی زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے کرسیاں گھسیٹیں، بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ نہ پوچھیے کیسے سرپرستانہ لہجے میں گفتگو کی ہے۔

مگر جب پلٹے تو محسوس ہوا کہ ہم اس سے بہت متاثر واپس آئے ہیں۔

■

بحوالہ: آپ بیتی مہاتما گاندھی

جوابات

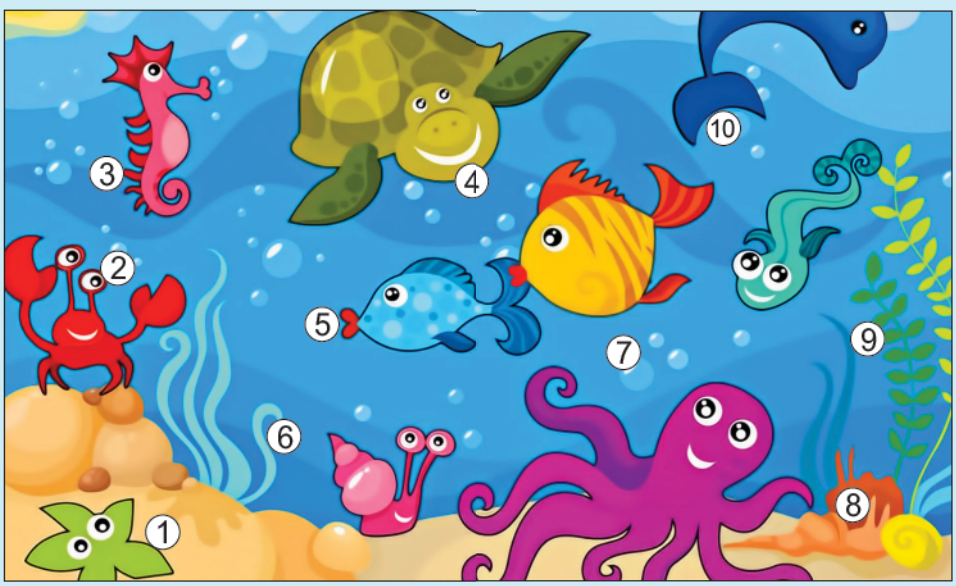

گاندھی جی کا خواب

گاندھی جی نے بچپن سے ہی خواب بہت دیکھے تھے
کبھی صحرا کی تپتی ریت پر ننگے پاؤں دوڑے تھے
کبھی کڑکتی بجلی کو بھی چھونے کی کوشش کی تھی
کبھی طوفانی رات میں اپنا دیا جلانے بیٹھے تھے
اک روز وہ جاہی پہنچے تھے چاند کی بڑھیا نانی تک
بڑھیا نانی دیکھ کے بولی ''آؤ میرے پیارے
چرخہ کات کے تھک گئی ہوں تو ہی اسے سنبھال
چرخے کا سندیش ہے دیسی چیزیں اور اہنسا
تیری ہمت، تیری محنت دیش کے کام آئے گی
نانی کا سندیش لے کر وہ دھرتی پر آئے
چرخہ کے اس خواب نے ان کو ایسا سبق پڑھایا
ہر گھر کی چرخہ بنا زینت اور زیبائش
ہندوستاں کی دھرتی پر جب آنے لگی کچھ تنگی

کبھی چلے تھے آگ پر، کبھی بارش میں بھیگے تھے
کبھی سمندر کی لہروں پر دوڑائے اپنے گھوڑے تھے
کبھی گرجتے بادل کے احوال کی پرسش کی تھی
کبھی کڑاکے کی سردی میں ہاتھ پاؤں بھی اینٹھے تھے
جن کو ہم سب جانتے ہیں صرف ایک کہانی تک
اب تو میرے دن ہوجائیں گے وارے نیارے
اب تک کسی بھی موئے نے نہ پوچھا میرا حال
تیرا بھارت لے رہا ہے تجھ سے ایک پرکشا
ان گوروں سے دیش کو مکتی بس یہی دلائے گی''
دیش کی آزادی کی فکر میں برسوں نہ سوپائے
ہر دشوار گذار رستے پر اپنا قدم بڑھایا
ہر ہندوستانی کے دل میں جاگی آزادی کی خواہش
سات سمندر پار ہوگئے جتنے بھی تھے فرنگی

گاندھی جی کا خواب یہی تھا،
گاندھی جی کا خواب!

■

Abul Lais Javed
H-17/II Ali Apts., Abul Fazal Enclave
New Delhi - 110025

راجکماری شنکر، مترجم: نامی انصاری

گاندھی جی افریقہ میں

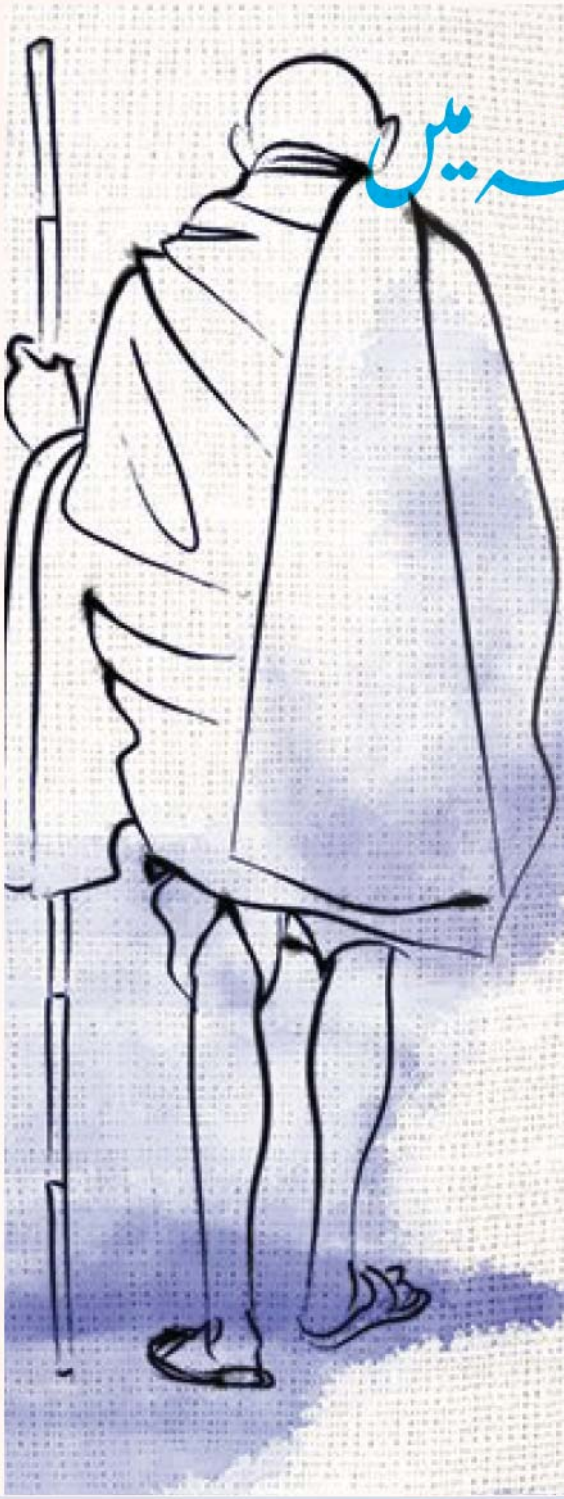

گاندھی جی نے راج کوٹ میں بیرسٹر کی حیثیت سے پریکٹس شروع کردی تھی۔ جلد ہی انھیں وہاں وکیلوں کے لالچی اور اوچھے برتاؤ سے نفرت ہوگئی۔

گاندھی جی نے محسوس کیا کہ غریب اور مسکین لوگوں کو عدالت سے انصاف ملنا مشکل ہے۔ وہ راج کوٹ میں اپنی زندگی سے خوش نہیں تھے اور وہ وہاں سے باہر جانا چاہتے تھے۔

تبھی انھیں جنوبی افریقہ جانے کی دادا عبداللہ اینڈ کمپنی کی طرف سے پیش کش ملی۔ کمپنی کا وہاں بہت بڑا کاروبار تھا۔ انھیں ایک مقدمہ دوسری کمپنی کے خلاف داخل کرنا تھا جو کہ چار سو ہزار ڈالر کا تھا۔ وہ گاندھی جی سے چاہتے تھے کہ وہ اس کیس کو لیں کیونکہ وہ اچھی طرح انگریزی بول لیتے تھے اور وہ انگریزی قانون سے بھی واقف تھے۔ اس کیس میں بحث کے علاوہ وہ کمپنی کی انگریزی میں خط و کتابت بھی انھیں سونپنا چاہتے تھے۔ ان کی خدمات ایک سال کے لیے درکار تھیں جس کے لیے کمپنی نے کافی فیس اور فرسٹ کلاس کا واپسی کرایہ دینے کا وعدہ کیا۔

ایک نئے ملک اور نئے لوگوں کو دیکھنے کا موقع پاکر گاندھی جی کا جوش ابھر آیا اور انھوں نے پیش کش کو منظور کرلیا۔

اتنی جلدی کستور با گاندھی سے دوبارہ جدائی ان کے لیے تکلیف دہ تھی لیکن انھوں نے جانے کا تہیہ کرلیا۔

اپریل 1893 میں وہ بمبئی سے جنوبی افریقہ جانے کے لیے روانہ ہوگئے۔

ہندوستان سے جنوبی افریقہ کا سفر طویل تھا۔ گاندھی نیٹال(Natal) کے پورٹ مئی 1893 کے آخر میں پہنچے۔ پہلی چیز جو انھوں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ وہاں ہندوستانیوں کو بہت کم عزت دی جاتی تھی۔ ڈربن پہنچنے کے ایک ہفتے کے اندر وہ دادا عبداللہ سیٹھ کمپنی کے عبداللہ سیٹھ کے ساتھ عدالت میں پیش ہوگئے۔

جیسے ہی وہ بیٹھے۔ مجسٹریٹ نے اپنی گول مٹول انگلی ان کی طرف اٹھائی۔

''آپ کو اپنی پگڑی اتار دینی چاہیے۔'' اس نے سختی سے کہا۔

گاندھی کو تعجب ہوا۔ انھوں نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور دیکھا کہ بہت سے مسلمان اور پارسی پگڑی پہنے ہوئے تھے۔ وہ یہ سمجھ نہیں سکے کہ صرف ان ہی کو کیوں ڈانٹ ڈپٹ کے لیے نشانہ بنایا گیا۔

''سر'' انھوں نے جواب دیا۔

''مجھے پگڑی اتارنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ میں ایسا کرنے سے انکار کرتا ہوں۔''

''آپ کو اسے اتارنا پڑے گا۔'' مجسٹریٹ دہاڑا۔

اس پر گاندھی نے کورٹ چھوڑ دیا۔

عبداللہ ان کے پیچھے گلیارے میں دوڑے اور ان کا بازو پکڑ لیا۔

''آپ نہیں سمجھتے۔'' وہ بولے۔

''میں آپ کو بتاؤں گا کہ کیوں یہ سفید چمڑی والے لوگ اس طرح برتاؤ کرتے ہیں۔ یہ ہندوستانیوں کو کم تر سمجھتے ہیں اور انھیں قلی اور سامی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ پارسی اور مسلمانوں کو پگڑی پہننے کی اجازت یوں دی گئی ہے کیونکہ ان کے یہاں اس پہناوے کی مذہبی اہمیت ہے۔

گاندھی کی سیاہ آنکھیں غصے سے چمک اٹھیں۔

انھوں نے کہا ''مجسٹریٹ نے میری بے عزتی کی ہے۔ ایسا قانون ایک آزاد آدمی کے لیے ایک توہین ہے اور میں ڈربن پریس کو فوراً خط لکھ کر اس طرح کے قانون پر احتجاج کروں گا اور گاندھی نے ایسا لکھ کر دیا۔ یہ خط شائع ہوا اور اسے غیر متوقع شہرت ملی۔ حالانکہ کچھ اخباروں نے گاندھی کو ایک ناپسند مہمان بتایا۔ ڈربن میں ایک ہفتے کے بعد وہ پریٹوریا کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہ وہاں ایک مقدمے کے لیے بلائے گئے تھے۔ فرسٹ کلاس ٹکٹ کے ساتھ وہ ٹرین میں بیٹھ گئے۔ اگلے اسٹاپ پر ایک انگریز ان کے ڈبے میں داخل ہوا۔ اس نے گاندھی کو گری ہوئی نظر سے دیکھا اور کنڈکٹر کو پکار کر کہا۔

''اس قلی کو باہر لے جاؤ اور اسے وہاں بٹھا دو جہاں اس کی جگہ ہے۔ میں ایک رنگین چمڑے والے آدمی کے ساتھ سفر نہیں کروں گا۔''

''جی اچھا۔'' کنڈکٹر نے ادب سے کہا۔

وہ پھر گاندھی کی طرف پلٹا۔ ''اے سامی! میرے ساتھ دوسرے کمپارٹمنٹ میں چلو۔'' وہ بولا۔

''نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔'' گاندھی نے نرمی سے کہا۔

''میں نے ایک فرسٹ کلاس ٹکٹ خریدا تھا اور مجھے یہاں رہنے کا پورا حق ہے۔'' ایک سپاہی کو اندر بلایا گیا اور اس نے گاندھی جی کو مع سامان کے باہر دھکیل دیا۔ اور ٹرین انھیں پلیٹ فارم پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ انھوں نے رات، اندھیرے ویٹنگ روم میں غصے سے کانپتے ہوئے گزار دی۔

گاندھی نے اس تجربے کو دل سے لگا لیا اور عہد کیا کہ چاہے اسے اس کی کوئی قیمت ادا کرنی پڑے وہ ان سب ناانصافیوں کے خلاف لڑیں گے۔ انھوں نے جنرل منیجر ریلوے کو ایک شکایتی خط لکھا مگر افسر نے اپنے اسٹاف کے برتاؤ کو صحیح بتایا۔

گاندھی کو دوسری مصیبت پریٹوریا کے سفر کے دوران پیش آئی۔ انھیں اسٹیج کوچ کے ذریعے چارلس ٹاؤن سے جوہانسبرگ کے لیے سفر کرنا پڑا تھا۔ حالانکہ ان کے پاس فرسٹ کلاس کا ایک ٹکٹ تھا مگر سفید رنگت والے کنڈکٹر نے انھیں اندر بیٹھنے کی اجازت نہیں دی۔

''تم بیرسٹر قلی۔'' وہ ہنسی اڑاتے ہوئے بولا۔

''تم اندر انگریز مسافروں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔ ٹکٹ ہو یا نہ ہو۔ باہر کوچ بکس پر بیٹھو۔ وہ میرے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ مگر میں اسے تمھیں دے دوں گا اور اندر تمھاری جگہ لے لوں گا۔''

گاندھی کو اس بے عزتی پر بہت غصہ آیا مگر بھاری دل سے وہ ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر چڑھ گئے وہ ابھی لڑائی لڑنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

''جب'' اسٹیج کوچ گھوڑے کی تبدیلی کے لیے رُکا تو کنڈکٹر پھر گاندھی کے پاس آیا۔

''اے سامی! تم نیچے بیٹھو۔ میں یہاں سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔''

کنڈکٹر نے کہا اور اس نے ایک گندی بوری نیچے گاندھی کے بیٹھنے کے لیے بچھا دی۔

گاندھی اس پر بھڑک اٹھے۔

''میرے پاس ایک فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا جس سے میں اندر بیٹھنے کا مستحق تھا۔'' انھوں نے کہا۔

''آپ نے مجھے یہاں بٹھایا۔ اب آپ مجھے یہاں قدموں میں بیٹھنے کو کہہ رہے ہیں۔

نہیں میں ایسا نہیں کروں گا۔''

''تمھیں ایسا کرنا پڑے گا۔'' کنڈکٹر چلایا۔

اور اس نے گاندھی جی کو مکے مارنے شروع کر دیے اور انھیں کھینچنے کی کوشش کی۔

گاندھی جی نے مزاحمت کی۔ کوچ کا ڈنڈا مضبوطی سے

پکڑے رہے مگر ایک گھونسے نے انھیں تقریباً نیچے گرا دیا۔

کوچ میں موجود کچھ مسافروں نے چیخنا شروع کر دیا۔

''اسے روکو، تنہا چھوڑ دو کنڈکٹر!'' وہ چلائے۔

''وہ صحیح ہے اسے آنے دو اور ہمارے ساتھ بیٹھنے دو۔''

کنڈکٹر کو انھیں اکیلا چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اگلی رات گاندھی جوہانسبرگ پہنچ گئے۔ راستے کے حادثے نے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کے پاس وہاں ایک مسلم تاجر کے گھر کا پتا تھا مگر رات بہت ہو چکی تھی۔ انھوں نے گرینڈ نیشن ہوٹل کے لیے ایک بگھی کرائے پر لی۔

ہوٹل منیجر نے ان پر ایک گہری نظر ڈالی اور کہا۔

''معاف کیجیے آج کی رات کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔''

گاندھی جان گئے کہ انھیں صرف کالی چمڑی ہونے کے سبب منع کیا گیا ہے۔ اب تاجر کے گھر کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس کے گھر رات گزارنے کے لیے چلے گئے۔ دوسرے دن انھوں نے ایک فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدا اور اپنا سفر پریٹوریا کے لیے جاری رکھا۔

ڈبے میں دوسرا مسافر ایک خوش پوش انگریز تھا۔ جیسے ہی گاندھی اندر داخل ہوئے انگریز نے اپنے اخبار سے نگاہ اٹھا کر اجنبی کو دیکھا اور اخبار پڑھنا جاری رکھا۔ کچھ ہی دیر میں کنڈکٹر اندر آ گیا۔

گاندھی نے فوراً ہی اسے اپنا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ دکھایا۔

''سامی! تمہارا ٹکٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔'' کنڈکٹر نے غرا کر کہا۔

''تم فوراً تھرڈ کلاس میں چلے جاؤ۔''

گاندھی کے جواب دینے سے پہلے انگریز نے اخبار سے نظر اٹھا کر کنڈکٹر کو گھورا۔

''تم اس شریف آدمی کو کیوں پریشان کرتے ہو؟'' اس نے زوردار آواز میں کہا، اس کا ٹکٹ اسے بیٹھنے کا حقدار بناتا ہے۔

پھر گاندھی کی طرف گھومتے ہوئے بولا ''اب آپ یہاں آرام سے بیٹھیں۔''

اس آدمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گاندھی وہیں بیٹھ گئے اور ایک کتاب ہاتھ میں لے لی۔

شام کو دیر سے ٹرین پریٹوریا پہنچی۔ اسٹیشن پر انھیں کوئی لینے نہیں آیا۔ اس لیے انھیں رات ایک ہوٹل میں گزارنا پڑی۔ اگلے دن ایک دوست انھیں ایک گھر میں لے گیا جہاں وہ کرائے پر رہتا تھا۔ وہاں گاندھی نے عبداللہ کے مقدمے سے متعلق کیس کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کیس کی مصروفیت کے باوجود انھوں نے پریٹوریا میں ہندوستانیوں کی ایک میٹنگ بلانے کا وقت نکال لیا۔ یہ کام انھوں نے طیب حاجی خاں محمد کی مدد سے کیا جو بہت اثر دار ہندوستانی تاجر تھے۔ صرف مٹھی بھر ہندوستانیوں نے اس میں شرکت کی۔

یہ پہلا موقع تھا جب گاندھی نے کسی میٹنگ کو مخاطب کیا۔

''ہم لوگوں میں بہت اختلاف ہیں۔'' انھوں نے کہا۔

ہم کیوں پیدائش، خاندان، ذات اور مذہب کی بنیاد پر بانٹے جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی ایک جماعت بنانی چاہیے جس میں ہر گروپ کی نمائندگی ہو اور پھر سرکار کو اپنی پریشانیوں اور ضرورتوں سے باخبر کریں۔

شرکاء نے انھیں بڑی دلچسپی سے سنا اور یہ طے پایا کہ یہاں پابندی سے سبھی ہندوستانیوں کے جلسے پریٹوریا میں ہوا کریں گے۔ اس درمیان گاندھی کو کمپنی کی طرف سے انگریزی

میں خط و کتابت کا ترجمہ کرنے کا کام سونپا گیا جو کمپنی اور مخالف پارٹی کے بیچ تبادلے میں ہوئی۔ انھوں نے سارے حقائق کو پڑھ کر جان لیا کہ موکل کا دعویٰ صحیح ہے۔

وہ جانتے تھے کہ اگر یہ کیس کورٹ میں جائے گا اس کے فیصلے میں طویل وقت لگ جائے گا اس لیے انھوں نے دونوں فریقین کے نمائندوں کی ایک مشترکہ میٹنگ بلائی۔

''کیوں تم لوگ ایک اچھا آدمی منتخب نہیں کر لیتے جس پر تم دونوں بھروسہ کر سکو اور جو تم دونوں کے بیچ ثالثی کر سکے۔''

نمائندوں نے ان کی بات بڑے غور سے سنی۔ وہ گاندھی کے اس نئے خیال کی پیشکش سے بہت متعجب ہوئے۔ یہ نوجوان آدمی ان عام وکیلوں میں سے نہیں تھا جن سے وہ واقف تھے۔ اس لیے انھوں نے اس پیشکش کو سراہا اور ان کے اس مشورے پر وہ راضی ہو گئے۔

ایک پنچ مقرر کیا گیا اور اس نے گاندھی کے موکل دادا عبداللہ اینڈ کمپنی کے حق میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ حالانکہ وہ جیت گئے تھے۔ گاندھی نے اپنے موکل کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنے مخالف سے رعایت برتیں۔ وہ راضی ہو گئے کہ فوراً روپیہ دینے کی مانگ نہیں کریں گے بلکہ ادائیگی آسان قسطوں میں لمبی مدت تک ہوگی۔ دونوں فریق اس فیصلے سے خوش تھے۔

گاندھی کی یہ پہلی کامیابی وکیل کی حیثیت سے اپنے مخالف کو ایک تباہ کرنے والی جیت نہیں تھی بلکہ یہ انسانیت اور اچھی سمجھ کی فتح تھی۔

■

مآخذ: گاندھی کی کہانی، **مصنف:** راجکماری شنکر، **مترجم:** نامی انصاری، **ناشران:** چلڈرن بک ٹرسٹ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، بچوں کا ادبی ٹرسٹ

مہاتما گاندھی کے لیے

وہ برکتوں والی رات آدھی
نئے اُجالے کی شاہزادی
حسین سا اِک پیام لائی
بہار آئی
بہار تیرے دوار آئی
غلام راتوں کے رتجگے ختم ہو چکے ہیں
غلام دن کی کہانیاں بھی گزر چکی ہیں
غلام یادوں کی داستانیں بھی سو رہی ہیں
نئی کہانی
نئی فضا ہے
نیا ہے دن، رات بھی نئی ہے
یہاں کی ہر بات بھی نئی ہے
وہ برکتوں والی رات آدھی [1]
تمہارے دم سے ہمیں ملی تھی
تمہارے یادوں کی رہ گزر کا چراغ تنہا
ابھی بھی روشن ہے
ہم نے اس کو جلائے رکھا ہے
آندھیوں میں

---

[1] کہتے ہیں ملک آدھی رات کو آزاد ہوا تھا۔

■

Sahir Daud Nagri
275/6, Lalita Park,
Laxmi Nagr, Delhi-110092

جشنِ مہاتما گاندھی

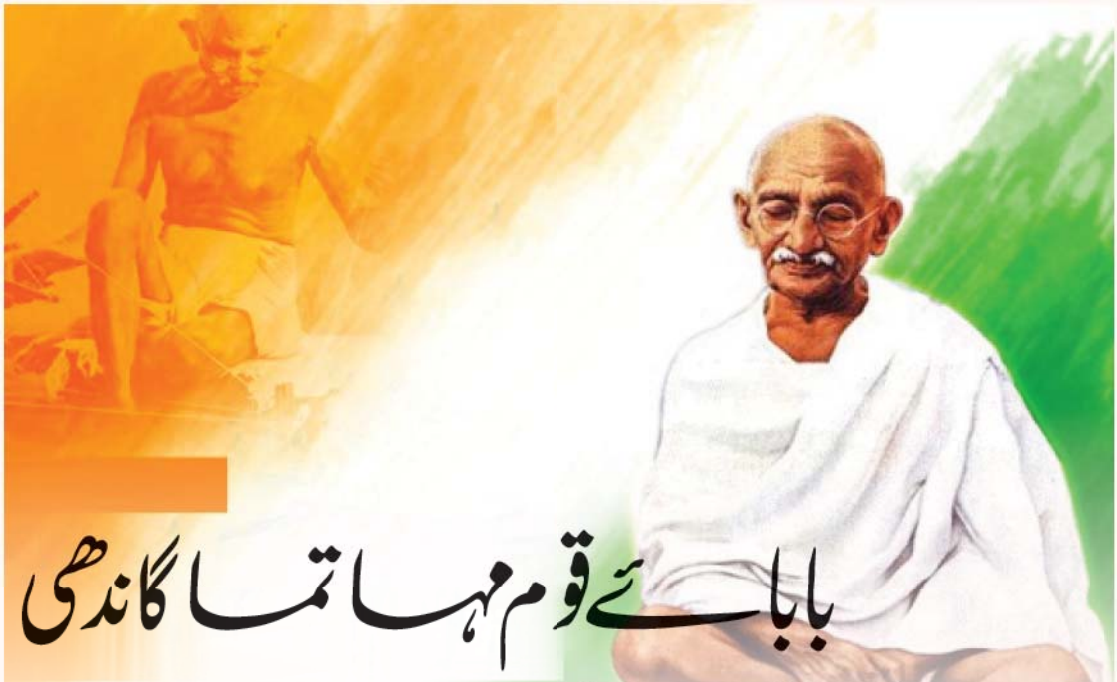

بابائے قوم مہاتما گاندھی

ہندوستان پر جب انگریزوں کا ظلم بڑھ گیا، تو ہندوستانی عوام نے 1857 میں پہلی جنگ آزادی چھیڑی جس میں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ بغیر کسی ثبوت کے توپوں سے اڑا دیا گیا۔ پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ ہندوستان کے کونے کونے میں اس جنگ کی چنگاری پھیل گئی۔

اسی دوران 2/اکتوبر 1869 کو پور بندر، گجرات میں ایک بچے کی پیدائش ہوئی اس کا نام موہن داس رکھا گیا۔ آگے چل کر یہی بچہ مہاتما گاندھی کہلایا۔ ابتدائی تعلیم اپنے ملک میں حاصل کرنے کے بعد 1888 میں مہاتما گاندھی بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن گئے۔ وہاں سے 3 سال بعد بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ہندوستان آئے۔

واپس آ کر بمبئی میں وکالت شروع کی مگر وہاں ان کا دل نہیں لگا۔ ایک کیس کے سلسلے میں افریقہ گئے تو وہاں ہندوستانیوں کے ساتھ جو سلوک دیکھا، اس سے وہ بے چین ہو گئے۔ وہاں اس کے لیے تحریک شروع کی اور یہیں سے انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ دیش کی سیوا کریں گے۔ ہندوستان آ کر آزادی کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے 20-1919 میں جب احتجاج کیا تو انھیں جیل بھیج دیا گیا۔ 1930 میں نمک آندولن کی شروعات کی اور سارے دیش کے لوگوں نے مل کر ان کا ساتھ دیا۔ سودیسی آندولن کے ذریعے انگریزی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اس تحریک کا مقصد تھا کہ لندن کی بنائی ہوئی چیزیں استعمال نہیں کی جائیں۔ اور ہندوستانی اشیا کا استعمال کیا جائے۔ اس تحریک میں مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، اور جواہر لعل نہرو کے ساتھ سبھی بڑے لیڈر گاندھی جی کے ساتھ تھے۔

گاندھی جی اہنسا کے پجاری تھے۔ جنگ آزادی میں کسی طرح کا جبر و تشدد کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایسا ہندوستان چاہتے تھے کہ جس میں ہندو مسلم سکھ عیسائی کے علاوہ

اور دوسرے سبھی مذاہب کے لوگوں کو برابری کا درجہ ملے۔ ان کے مطابق پیار مذہب کی بنیاد ہے۔ ہمیں ہر ایک مذہب نے ایک دوسرے سے پیار کرنا سکھایا ہے۔ یہ سب باتیں گاندھی جی کی زندگی میں رہیں اور اسے انھوں نے اپنی زندگی میں ڈھال لیا تھا۔ بڑی سیدھی سادی زندگی گزاری۔ صرف دھوتی بغیر کرتے کے اور چپل پہن کر بغیر کسی ہتھیار کے آزادی کی جنگ لڑی۔ 1942 میں ''بھارت چھوڑو'' تحریک شروع کی گئی۔ یہ آزادی حاصل کرنے کی تحریکوں میں سب سے بڑی تحریک تھی۔

گاندھی جی کے ساتھ ساتھ ہزاروں افراد جیل میں بھر دیے گئے۔ عوام کے غصے کی انتہا ہوگئی۔ انگریز خوف زدہ ہوگئے اور آخر میں انھوں نے ہندوستان سے کوچ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ میٹنگ ہوئی، مشورے ہوئے اور 14/ اگست 1947 کو انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ کر اپنے وطن لندن جانا پڑا۔

گاندھی جی نے اس جنگ کے لیے اپنی زندگی کے 36 سال لگا دیے۔ ان کی یہ قربانی دنیا کی تاریخ میں ایک مثال بن گئی۔ گاندھی جی کی موت 30 جنوری 1948 کو ہوئی۔

■

Mr. Khaliquz Zaman Nusrat
Kaaenat Publication, Flat No 15, Bld No4
Sai Nagar Colony
Bhiwandi - 421302 (MS)

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'بچوں کی دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر ..... بتاریخ .....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : .....

پتہ : .....

.....

.....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

دستخط

محمد شمیم اختر

گاندھی جی

سچائی، عدم تشدد اور صفائی ستھرائی کے پیامبر

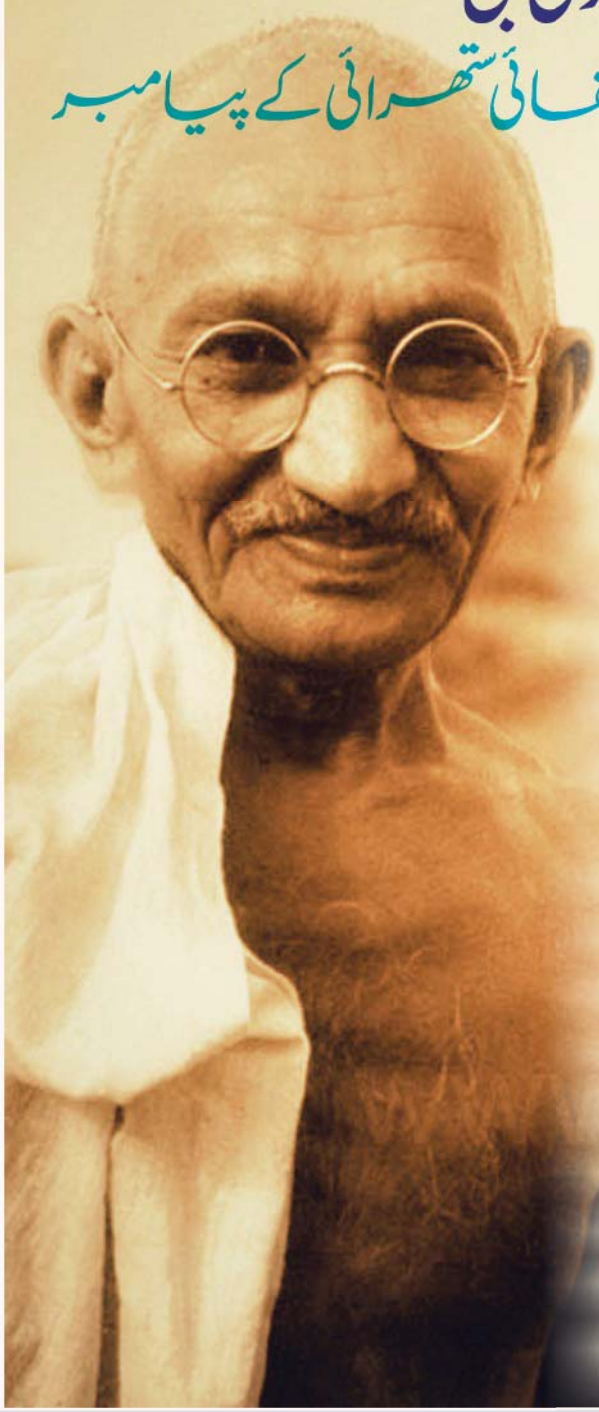

آج ہمارا پیارا وطن ہندوستان آزاد ہے۔تقریبا 300 برسوں کی انگریزوں کی ظالمانہ حکومت کے بعد 15 اگست 1947 کو ہمیں آزادی ملی لیکن یہ آزادی ہمیں یوں ہی نہیں ملی بلکہ اس کے لیے طویل عرصے تک جدوجہد کرنی پڑی اور بہت قربانیاں دینی پڑیں۔ گاندھی جی، بال گنگادھر تلک، بھگت سنگھ، سبھاش چندر بوس، سردار ولبھ بھائی پٹیل، بیگم حضرت محل، اشفاق اللہ خان، تانتیہ ٹوپے، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر راجندر پرساد، لال بہادر شاستری، جواہر لعل نہرو اور بہت سارے دیگر مجاہدین آزادی تھے جو ملک کو آزاد کرانے میں پیش پیش رہے۔ان میں گاندھی جی کا تعاون بے مثال رہا ہے۔

موہن داس کرم چند گاندھی جنہیں احترام سے مہاتما گاندھی اور باپو کہا جاتا ہے، آزادی کی تحریک کے اہم ترین کردار تو تھے ہی ساتھ ہی سچائی اور عدم تشدد کی علامت تھے۔وہ صفائی ستھرائی کے پیامبر تھے۔باپو کے نظریات میں عدم تشدد یعنی اہنسا سب سے اہم رہا ہے۔یہ ان کا عدم تشدد تھا جس نے انگریزوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔انھوں نے اسے زندگی جینے کا ایک طریقہ قرار دیا۔وہ کہا کرتے تھے کہ ایک نرم لہجے سے آپ پوری دنیا کو ہلا سکتے ہیں۔آج کے اس دور میں جب کہ

تشدد عالمی سطح پر ایک سنگین مسئلہ بنتا جارہا ہے گاندھی جی کے اس نظریے کی اہمیت کافی بڑھ جاتی ہے۔

بابائے قوم مہاتما گاندھی کی کوشش ہمیشہ ہی ذات پات، مذہب، رنگ ونسل اور زبان کی سطح پر مختلف طبقوں کے درمیان بھائی چارہ اور محبت پیدا کرنے کی رہی۔ باپو کہا کرتے تھے اگر ہم دنیا میں حقیقی امن چاہتے ہیں تو ہمیں اس کا آغاز بچوں سے کرنا ہوگا۔ان کا کہنا تھا کہ جہاں پیار ہے، محبت ہے وہیں زندگی ہے۔

گاندھی جی نے سچائی کو اپنی زندگی میں بچپن سے ہی اپنایا تھا۔ان کی سچائی کو پیش کرتا ان کے بچپن کا ایک واقعہ ہے جب ان کے استاد کے کہنے کے باوجود انھوں نے نقل نہیں کی۔قصہ یوں ہے کہ ایک بار راجکوٹ کے الفریڈ ہائی اسکول میں اس وقت کے محکمہ تعلیم کے انسپکٹر جائلس معائنہ کرنے آئے تھے۔

انھوں نے نویں جماعت کے طلبا کو انگریزی کے پانچ الفاظ لکھنے کو دیے جس میں ایک لفظ تھا 'کیٹل'۔موہن داس اسے درست طریقے سے نہیں لکھ سکے تو ماسٹر صاحب نے اشار ہ کیا کہ آگے والے لڑکے کی نقل کرلو لیکن موہن داس نے ایسا نہیں کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ان کے ہی لکھنے میں غلطی نکلی اور سب کے پانچوں الفاظ درست تھے۔ جب ماسٹر صاحب نے پوچھا کہ تم نے نقل کیوں نہیں کی تو موہن داس نے جواب دیا کہ ''ایسا کرنا دھوکہ دینے اور چوری کرنے جیسا ہے جو میں ہر گز نہیں کرسکتا۔'' گاندھی جی کو قریب سے جاننے والے کہتے ہیں کہ گاندھی جی نے لندن سے وکالت کی ڈگری حاصل کی تھی اور لمبے عرصے تک وکالت بھی کی تھی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پائے کیونکہ وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔

گاندھی جی صفائی ستھرائی کے معاملے میں کافی سنجیدہ

تھے اور اس کے لیے خود آگے بڑھ کر لوگوں کو صفائی ستھرائی کرنے کے لیے کہا کرتے تھے۔ گاندھی جی باہری صفائی کے ساتھ ساتھ اپنے اندر کی صفائی پر بھی توجہ دیتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے ''اندرونی صفائی پہلی اہم بات ہے جسے پڑھایا جانا چاہیے۔ باقی باتیں اسے پڑھائے جانے کے بعد ہی نافذ کی جانی چاہیے۔''

گاندھی جی کا کہنا تھا ''اگر کوئی شخص اپنی صفائی ستھرائی کے ساتھ دوسروں کی صفائی ستھرائی کے تئیں حساس نہیں ہے تو ایسی صفائی کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اسے اپنا گھر صاف کر کوڑا کرکٹ دوسرے کے گھر کے باہر پھینک دینے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر سب لوگ ایسا کرنے لگیں تو ایسے میں ہم سب خراب ماحول اور خراب سماج کی تعمیر کریں گے۔''

گاندھی جی کا کہنا تھا ''ہم اپنے گھروں سے گندگی ہٹانے میں یقین رکھتے ہیں لیکن معاشرے کی پرواہ کیے بغیر اسے گلی میں پھینکنے پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہم ذاتی طور پر صاف ستھرے رہتے ہیں لیکن قوم اور معاشرے کے ممبر کے طور پر نہیں جس میں کوئی شخص چھوٹا حصہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے گھر کے دروازوں پر اتنی زیادہ گندگی اور کوڑا کرکٹ پڑا ہوا پاتے ہیں۔ ہمارے آس پاس کوئی اجنبی یا باہری لوگ گندگی پھیلانے نہیں آتے۔ یہ ہم ہی ہیں جو اپنے آس پاس کے علاقے کو گندہ کرتے ہیں۔''

بابائے قوم مہاتما گاندھی کی صفائی ستھرائی کی اسی کوشش کی وجہ سے حکومت ہند نے ان کے یوم پیدائش پر 2014 میں خصوصی صفائی مہم، 'سوچھ بھارت مشن' کا آغاز کیا تھا۔ وزیر اعظم نریندر مودی کی مرکزی حکومت کی جانب سے بابائے قوم کو یہ ایک بہتر خراج تحسین ہے۔ لہٰذا اب ضرورت ہے کہ ہم بھی خود کو صاف ستھرا رکھیں اور ساتھ میں اپنے معاشرے کو بھی صاف رکھیں تاکہ ہم صحت مند رہ سکیں اور ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کر سکیں کیونکہ باپو اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص صاف ستھرا نہیں ہے تو وہ صحت مند بھی نہیں رہ سکتا اور اگر وہ صحت مند نہیں ہے تو وہ صحت مند دماغ کا مالک بھی نہیں ہو سکتا۔

یہ گاندھی جی کی شخصیت کا ہی اثر تھا کہ بھارت کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے والے انگلینڈ نے جب پہلی دفعہ کسی عظیم انسان پر ڈاک ٹکٹ نکالا تو وہ مہاتما گاندھی ہی تھے۔ اس سے پہلے برطانیہ میں ڈاک ٹکٹ پر صرف بادشاہ یا ملکہ کی ہی تصویریں چھپتی تھیں۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی پر سب سے زیادہ ڈاک ٹکٹ ان کی سویں یوم پیدائش پر 1969 میں جاری ہوئے تھے۔ اس سال پوری دنیا کے 35 ممالک نے ان پر 70 سے زیادہ ڈاک ٹکٹ جاری کیے تھے۔

گاندھی جی کا یوم پیدائش (گاندھی جینتی 2 اکتوبر) بھارت میں قومی تعطیل کا درجہ رکھتا ہے اور دنیا بھر میں اسے یوم عدم تشدد کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اردو کے مشہور شاعر مجاز لکھنوی نے گاندھی جی کے انتقال پر ان الفاظ میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں ایک انساں چلا گیا

■

Mohd Shamim Akhtar
S-15/7, Jogabai Ext. Jamia Nagar
New Delhi - 110025

محمد انیس الرحمن خان

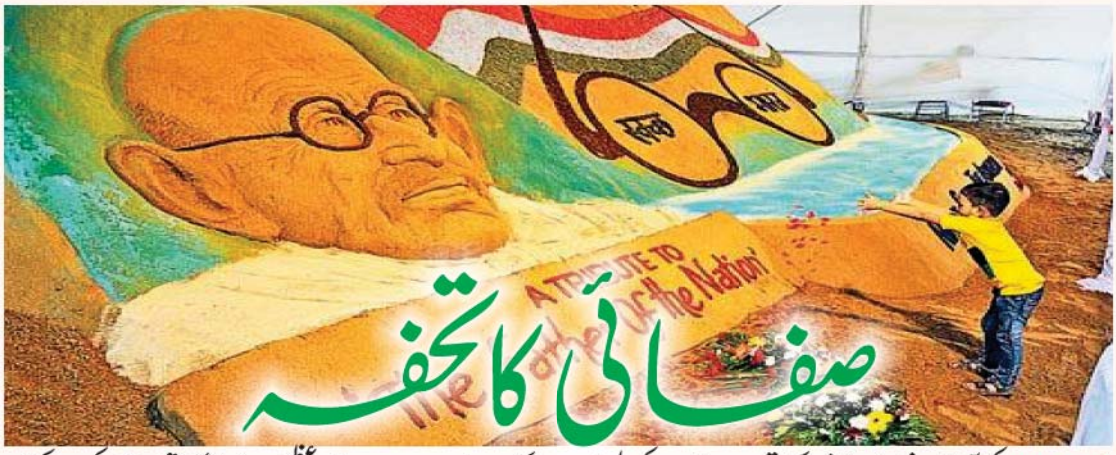

صفائی کا تحفہ

ٹور بیل کی آواز سنتے ہی شانو کے قدم دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ گیٹ کھلتے ہی سامنے پاپا مسکراتے ہوئے بولے ''کیا بات ہے بیٹا آج آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں'' شانو نے کہا کہ پاپا! پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیجیے پھر کوئی کام کیجیے گا، پاپا نے کہا بولو بیٹا کیا بات ہے؟ پاپا آج میں نے اپنے اسکول کی دیوار پر چشمہ والی ایک خوبصورت سی تصویر دیکھی، جس کی ایک آنکھ میں 'سوچھ' اور دوسری آنکھ میں 'بھارت' لکھا ہوا تھا، یہ کیا ہے پاپا؟ اور یہ چشمہ کس کا ہے؟ وراس میں ایسا کیوں لکھا ہے؟ شانو نے ایک ہی سانس میں کئی سوال اپنے ابّو سے کرڈالے۔ جواب میں پاپا نے کہا بیٹا اگر آپ غور کریں تو ایسی تصویر آپ کو 'بچوں کی دنیا' نامی رسالے میں جو آپ کے لیے لایا ہوں، اس پر بھی مل جائے گی اوراس میں ایک سطر اور بھی تحریر ہے کہ ایک قدم صفائی کی طرف۔ دراصل اس چشمے کو گاندھی جی کے چشمے سے منسوب کیا جاتا ہے، کیونکہ ہمارے موجودہ وزیراعظم نے سال 2014 میں تاریخی عمارت لال قلعے سے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہم سب کو مل کر اپنے ملک کو صاف ستھرا بنانا ہے، جب ہمارا ملک صاف ستھرا اور گندگی سے پاک ہوگا تو ہم سب صحت مند رہیں گے اور یہی ہندوستانی قوم کے معمارو سرپرست اور عظیم رہنما گاندھی جی کی 2 اکتوبر 2019 کو 150 ویں یوم پیدائش پر قوم کی طرف سے بہترین خراج عقیدت ہوگی۔ اتنا ہی نہیں، ملک کے وزیراعظم نے اپنی تقریر کے بعد عملی طور پر اس مہم کا آغاز گاندھی جی کی یوم پیدائش پر 2/اکتوبر سال 2014 کو ہندوستان کی دارالحکومت نئی دہلی کے راج پتھ سے کیا تھا۔ آپ نے ان کے ہاتھوں میں جھاڑو والی تصویر کہیں دیکھی ہوگی نا؟

شادان نے کہا ہاں چاچو میں نے اپنے اسکول کے نوٹس بورڈ پر وزیراعظم کی جھاڑو دینے والی تصویر تو دیکھی تھی، مگر معلوم نہیں تھا کہ یہ کیوں ہے۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرا بھی شک دور کردیا، عارش نے لقمہ دیتے ہوئے کہا ارے یار شادان بھائی آپ نے اسی تصویر کے برابر میں ہمارے پرنسپل صاحب کی فوٹو نہیں دیکھی کیا؟ وہ بھی تو جھاڑو لے کر اپنے اسکول میں صفائی کر رہے تھے۔ اور یہ تصویر تو اخبار میں بھی شائع ہوئی تھی۔ دراصل شادان اور ریبا شانو کے بڑے پاپا کے بچے تھے اور دونوں شانو سے عمر میں بڑے تھے، اس لیے وہ بھی شانو کو بہت پیار کرتے تھے، جبکہ عارش چھوٹے چاچو کا بیٹا تھا۔ جو دوران گفتگو اپنے اپنے گھروں سے آکر شامل ہوگئے

تھے۔آپا ہونے کے ناطے ریبا نے کہا آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ گاندھی جی کا پورا نام کیا تھا؟ شادان نے جھٹ سے جواب دیا ہے مجھے تو معلوم ہے ان کا پورا نام موہن داس کرم چند گاندھی ہے۔اور کیا؟

شانو نے پاپا سے کہا اب آپ جا کر کپڑے بدل لیجیے ہم لوگ ریبا آپی سے باتیں کرتے ہیں، او کے پاپا۔ اچھا بچو! اب میں ذرا چائے پی لیتا ہوں کوئی ضرورت ہو تو آپ مجھے یاد کر لینا۔ ٹھیک ہے چاچو آپ جائیں، مگر ریبا آپی یہ تو بتائیے کہ گاندھی جی پیدا کہاں اور کب ہوئے تھے، عارش نے معصومیت سے پوچھا! تو ریبا نے بتانا شروع کیا، شادان نے بالکل صحیح نام بتایا ہے، ان کی پیدائش 2 اکتوبر 1869 کو ریاست گجرات کے پوربندر میں ہوئی تھی، ان کے والد انگریزی حکومت میں پوربندر کے دیوان تھے، ان کی والدہ انتہائی مذہبی خاتون تھیں، ان کا نام پتلی بائی تھا۔ شادان نے دریافت کیا اور ان کے والد کا نام کیا تھا آپی؟ ریبا نے مسکراتے ہوئے کہا ارے شادان تم نے ہی تو ان کا نام ابھی بتایا نا، میں نے؟ میں نے کب بتایا! میں نے تو صرف گاندھی جی کا ہی نام بتایا تھا۔ ریبا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ارے بدھو! گاندھی جی کا نام تو صرف موہن داس ہے اور ان کے والد کا نام 'کرم چند' تھا۔ انھیں کرم چند کی چوتھی بیوی تھیں گاندھی جی کی والدہ محترمہ پتلی بائی۔ سمجھ میں آئی بات۔ اچھا تو اسی لیے گاندھی جی کا پورا نام موہن داس کرم چند گاندھی ہے۔ ہاں شانو بھائی اسی لیے۔ شانو نے مزید دلچسپی لیتے ہوئے کہا اور کچھ بتائیے نا آپی، مجھے تو بہت مزہ آرہا ہے، ہے نا عارش بھائی؟ ٹھیک ہے سنو! ان کی والدہ آج کی عورتوں کی طرح اپنے زیور اور سنگار پر توجہ نہیں دیتی تھیں، بلکہ انہوں نے اپنے وقت کو دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ ایک حصہ گھر کے کاموں کے لیے دوسرا حصہ مذہبی کاموں اور عبادت کے لیے۔ جی ہاں! وہ تشدد کو بالکل بھی پسند نہیں کرتی تھیں، ممی نے پاپا کے لیے چائے اور بچوں کے لیے بسکٹ کی پلیٹ رکھتے ہوئے کہا۔ پاپا چائے پیتے ہوئے کہنے لگے، ان کی تربیت کا اثر ہمیں گاندھی جی کی زندگی میں بھی نظر آتا ہے کہ گاندھی جی نے انگریزوں کو اپنے ملک سے بھگانے کے لیے عدم تشدد کا سہارا لیتے ہوئے آزادی کی لڑائی میں 'تحریک عدم تعاون' کی شروعات دسمبر 1920 میں کی۔ جس کے نتیجے میں ہمیں ایک شاندار یونیورسٹی بھی ملی، جس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ہے۔ اس کی بنیاد علی گڑھ میں 1920 میں رکھی گئی تھی۔

ریبا نے آگے کہنا شروع کیا: گاندھی جی محنتی طالب علم تھے۔ ان کی انگریزی بہت اچھی تھی، لیکن ان کی تحریر یعنی ہینڈ رائٹنگ اچھی نہیں تھی جس کا افسوس گاندھی جی کو زندگی بھر رہا۔ ان کی شادی بھی بہت جلدی صرف 13 سال کی عمر میں کستور با نامی ایک لڑکی سے ہوگئی تھی جس کی وجہ سے ان کے اسکول کا ایک سال یوں ہی برباد ہوگیا، انھیں کلاس روم میں یا کھیل کے میدان میں کھیلنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ اکیلے رہنا زیادہ پسند کرتے تھے، اپنی ماں سے بہت محبت کرتے تھے، ان کے گھریلو کاموں میں ہاتھ بھی بٹاتے تھے۔

سال 1887 میں گاندھی جی نے ممبئی یونیورسٹی سے

میٹرک (دسویں جماعت) پاس کیا اور بھاؤنگر کالج میں داخلہ لیا۔ اور 19 سال کی عمر میں قانون کی پڑھائی کرنے کی غرض سے لندن کا سفر کیا۔ 1891 میں ہندوستان واپس آکر ممبئی میں اپنی وکالت کی شروعات کی۔ مگر ایک کیس کے سلسلے میں انھیں اپنی بیوی کستور با گاندھی اور بچوں کے ساتھ جنوبی افریقہ جانا پڑا، جہاں وہ تقریباً 20 برسوں تک رہے۔

شادان نے ریبا کی بات مکمل ہوتے ہی زور سے کہا ''اچھا گاندھی جی کو انگریزوں نے ساؤتھ افریقہ میں ہی ٹرین سے اُتار دیا تھا نا۔'' چھوٹے شانو نے معصومیت سے پاپا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ شادان بھائی کیا کہہ رہے ہیں پاپا؟ ارے بیٹا ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مئی 1893 میں جب گاندھی جی اپنے کام سے پریٹوریا جا رہے تھے تو ایک گورے انگریز نے گاندھی جی کے فرسٹ کلاس میں سفر کرنے پر اعتراض کیا، اور حکم دیا کہ تم ٹرین کے سب سے پچھلے حصہ وین کمپارٹمنٹ میں جاؤ، گاندھی جی کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ اس لیے انھوں نے جانے سے انکار کر دیا، آخر کار انگریز کو غصہ آیا اور اس نے گاندھی جی کو ٹرین سے نیچے پھینک دیا۔ عارش نے تعجب سے پوچھا لیکن پاپا گاندھی جی کو انگریز نے کیوں پھینک دیا، جب کہ ان کے پاس ٹکٹ بھی تھا۔ شادان نے کہا کہ بھائی انگریز ہم ہندوستانیوں سے نفرت کرتے تھے، ہمیں اپنا غلام سمجھتے تھے، ہمارے رنگ کو بُرا جانتے تھے، اور تو اور وہ ہم ہندوستانیوں کو انسان تک نہیں تسلیم کرتے تھے۔ ہاں شانو اسی لیے تو گاندھی جی اپنے عیش و آرام اور سوٹ بوٹ کی زندگی کو خیر باد کہہ کر اپنے ملک واپس آ گئے اور انگریزوں کی غلامی سے ہم سب کو آزاد کرنے میں تن، من، دھن سب لگا دیا۔ تو بولو ہیں نا ہم بچوں کے پیارے گاندھی، ہاں ہاں، ریبا آپی ہم سب کو گاندھی جی سے پیار کرنا چاہئے۔ میں تو اب ان کے چشمے سے بھی پیار کروں گا اور اس پر لکھی ہوئی تحریر یعنی سوچھ۔ بھارت پر بھی ہم سب بچے عمل کریں گے، تاکہ اب سے ٹھیک ایک سال بعد ہم لوگ اپنے وزیر اعظم کے خواب کو پورا کرتے ہوئے راشٹریہ پتا کو ان کے یوم پیدائش پر صفائی کا تحفہ دے سکیں۔ ہے نا عارش، ہے نا شادان بھائی؟ اور آپ سب ننھے دوستو!؟

سورس

https://www.britannica.com/biography/Mahatma-Gandhi
https://www.history.com/topics/mahatma-gandhi
http://www.pmindia.gov.in/en/major_initiatives/swachh-bharat-abhiyan/

■

Mohd Anisur Rahman Khan
Ground Floor, F-11/13, Street No: 6/6
Jogabai, Batla House
New Delhi - 110025

تصحیح نامہ

'بچوں کی دنیا' کے اگست 2018 میں شائع مضمون 'مجاہد آزادی: مولانا فضل حق خیر آبادی' میں کچھ تاریخی غلطیاں در آئی ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد 1850 میں نہیں بلکہ 1885 میں پڑی تھی۔ سرسید احمد خاں نے محمڈن کالج 1875 میں قائم کیا تھا جبکہ دارالعلوم دیوبند کا قیام 1866 میں ہوا تھا۔ سرسید مجاہد آزادی نہیں تھے۔ قلم کاروں سے درخواست ہے کہ اپنی تحریریں بھیجنے سے پہلے اسے اچھی طرح درست کر لیں۔ یادداشت پر بھروسہ نہ کریں بلکہ تاریخی حوالوں کی مدد لیں۔

ادارہ اس غلطی پر معذرت خواہ ہے!

گاندھی جی

پیارے بچو! راشٹر پتا مہاتما گاندھی کو آپ اور ہم سبھی لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔ گاندھی جی کا پورا نام موہن داس کرم چند تھا۔ وہ سال 1869 میں پور بندر کاٹھیا واڑ میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں انھیں اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ دو سال بعد انھیں تعلیم کے سلسلے میں راجکوٹ جانا پڑا، راجکوٹ جا کر گاندھی جی نے 'راجہ ہریش چندر' ناٹک دیکھا جس میں راجہ ہریش چندر نے سچائی کا راستہ اپنایا اور سچائی کی راہ میں انھوں نے اپنے بیوی بچوں کو بھی قربان کر دیا۔ پہلے زمانے میں بچوں کا دل بہلانے اور معلومات میں اضافہ کرنے اور تفریح کے طور پر بھی ناٹک اور اسٹیج ڈراموں کا بہت چلن تھا کیونکہ اس وقت نہ ٹوٹی۔ وی عام تھا اور نہ موبائل۔ گاندھی جی نے اپنے ساتھی بچوں کے ہمراہ اس ناٹک کو دیکھا۔ شاید کسی بچے کے ذہن پر اس ناٹک نے اس طرح اثر نہیں کیا ہوگا جس طرح گاندھی جی کے ذہن کو متاثر کیا اور انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیوں نہ ہم بھی ہریش چندر جیسے سچائی پسند بن جائیں کچھ بھی ہو جائے سچائی کے راستے سے نہ ہٹیں۔ بچپن کی اس سیکھ نے ان کے دل و دماغ پر ایسے نقش بٹھا دیے کہ انھوں نے زندگی بھر اس اچھی بات پر عمل کیا اور وہ سچائی و اہنسا کے پجاری کے نام سے مشہور ہوئے۔

گاندھی جی کو بڑوں کی برائی نظر نہیں آتی تھی اگر کسی

بڑے کی کوئی ناگوار بات سامنے آجاتی تو اسے کسی کو نہیں بتاتے۔ بلکہ پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے کیونکہ انھوں نے بڑوں کی فرماں برداری سیکھی تھی ان پر نکتہ چینی کرنا نہیں، بزرگوں کی غلطیوں کو نظر انداز کرنا ان کی فطرت میں تھا۔اسی لیے ان سے سب پیار کرتے۔اور وہ پیارے باپو کہلائے۔

سولہ برس کی عمر کو پہنچے تو والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یہ ان کی زندگی کا پہلا صدمہ تھا لیکن انھوں نے اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھا۔اٹھارہ سال کی عمر میں میٹرک پاس کیا۔میٹرک کے بعد بڑے بھائی نے انھیں اسی تعلیمی سفر کو آگے بڑھانے کے لیے انگلستان بھیج دیا۔کیونکہ انھیں پڑھنے لکھنے کا بیحد شوق تھا اسی سلسلے میں وہ کئی ملکوں میں گئے انگلینڈ میں دورانِ تعلیم انھوں نے عیسائیوں کی مذہبی کتاب انجیل کا مطالعہ کیا۔تھامس کارلائل کی کتاب جو محمد صاحب کی زندگی پر ہے۔گاندھی جی نے غور سے پڑھا۔انھوں نے ہندو مذہب کے ساتھ ساتھ ہر دھرم کا احترام کیا آنکھوں سے لگایا اور دل میں بسایا۔اس اچھی عادت کی وجہ سے ہر قوم اور طبقہ نے انھیں سینے سے لگایا۔انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے مشرق اور مغرب کے فرق کو سمجھا، پھر ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو گہرائی سے دیکھا الگ الگ کلچر اور جدا جدا زبانیں رکھنے والی قوموں کا مطالعہ کیا۔پسماندگی، غریبی، جہالت، ظلم وستم وغیرہ کے بارے میں خوب سوچا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اہنسا اور پیار و محبت ہی سارے مسئلوں کا حل ہے۔

10 جون 1891 میں وہ انگلینڈ سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے اپنے وطن ہندوستان واپس آئے اور یہاں آکر وکالت شروع کردی لیکن سیاسی ماحول اور انگریزوں کے ظلم وستم نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا وہ صرف اور صرف ہندوستانیوں کی بھلائی اور فلاح کے بارے میں سوچتے رہتے کہ کس طرح اپنی قوم کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرائیں۔ 1901 میں وہ جنوبی افریقہ سے ایک نئی جوت جگا کر ہندستان لوٹے اور سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے لگے۔اور بابائے قوم کہلائے۔

ہمارے ملک ہندوستان کی یہ بہت بڑی خوش نصیبی رہی کہ اسے گاندھی جی جیسے ہمدرد اور امن پسند رہنما کی قیادت نصیب ہوئی، ان کا نام آتے ہی ذہن میں سادگی اہنسا، سچائی، ہمدردی، محبت، انسانیت، اتحاد واتفاق اور بھائی چارے کا مجسمہ نمودار ہوجاتا ہے۔ان کی زندگی ایک صاف شفاف آئینہ کی مانند تھی۔وہ جیسا کہتے ویسا ہی عمل بھی کرتے، ان کے قول وفعل میں ہمیں فرق نظر نہیں آتا، لہٰذا ان کے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے مضبوط ارادے، بلند حوصلے، جرأت مند دل، صبر وضبط، پر اعتماد انداز اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہے۔کیونکہ سچائی اور ایمانداری کا راستہ اپنانے والوں کو قدم قدم پر مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔دنیا کے بہت سے کام ایسے ہیں جنھیں ہم آسانی سے اختیار کر کے اپنی عادت میں شامل کر سکتے ہیں، اور سماج میں اپنا ایک مقام بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ گاندھی جی کی زندگی اور ان کی تعلیمات اس کی زندہ مثال ہیں۔ ان کی زندگی کھلی کتاب ہے جو ہر قدم پر ان کے چاہنے والوں کی رہنمائی کرتی ہے۔

■

Dr. Zaiba Naaz
Lec.Gulab Singh Hindu P.G
College, Chand Pur-246725, Bijnor, U.P

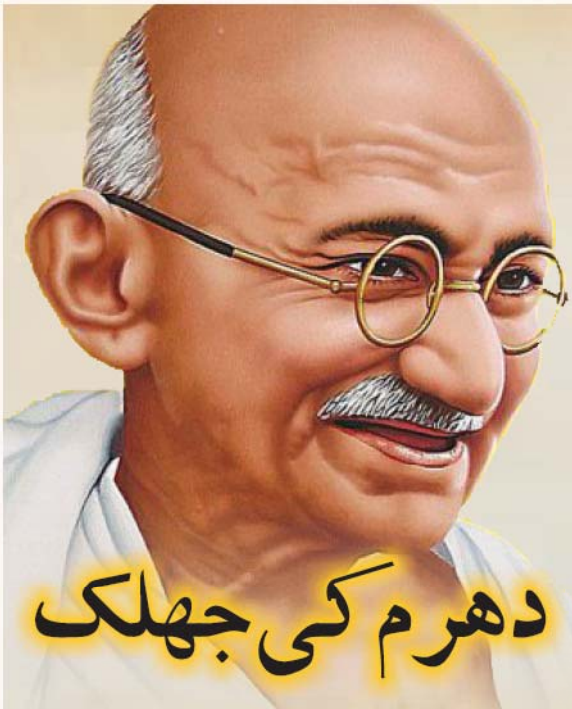

دھرم کی جھلک

دھرم کوٹ میں مجھے ہر ایک فرقے سے رواداری کی تربیت ملی تھی۔ میں نے ہندو دھرم کے ہر ایک فرقے سے رواداری رکھنے کی تعلیم پائی کیونکہ ماتا پتا ویشنو مندر شوآلیہ اور رام مندر میں بھی جاتے اور ہم بھائیوں کو بھی لے جاتے اور بھیجتے تھے۔

اس کے علاوہ پتاجی کے پاس ایک نہ ایک جین دھرم آچاریوں میں سے کوئی نہ کوئی ہمیشہ آتے رہتے۔ پتاجی بھکشا دے کر ان کی آؤ بھگت بھی کیا کرتے تھے۔ وہ پتاجی کے ساتھ دھرم اور ویوہار پر چرچا بھی کیا کرتے تھے۔ کئی بار وہ اپنے اپنے دھرم کی باتیں سنایا کرتے اور پتاجی آدر، اور محبت کے ساتھ ان کی باتیں سنتے۔ ایسے ذکر اذکار کے وقت میں ان کا خدمت گار ہونے کی وجہ سے عموماً موجود رہتا تھا۔ اس سارے کرہ ہوائی کے اثر سے میرے آلہ خیال میں تمام دھرموں کی عزت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔

اس طرح میرے جی میں دوسرے دھرموں سے عزت کا خیال آیا لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت مجھے ایشور کی ہستی کا بھی احساس تھا مگر ایک بات نے میرے دل میں گھر کرلیا وہ یہ کہ دنیا حکمت عملی پر انحصار رکھتی ہے اور حکمت واحد تر حقانیت پر منحصر ہے مگر حق کی تلاش تو ابھی باقی ہے۔ دن بدن حق کی عظمت میرے خیال میں بڑھتی گئی۔

اس وقت حکمت عملی کے متعلق ایک مخمس میرے جذبات پر غالب آیا۔ بدی کا بدلہ بدی نہیں بلکہ بھلائی ہی ہونا چاہیے۔ یہ بات رشتہ زندگی بن گئی۔ اس نے میرے دل پر اپنا اثر چلانا شروع کردیا۔ بدی کا بدلہ چاہنا اور کرنا اس کا میں معتقد بن گیا۔ اس کے بے انداز تجربے کیے۔ ایسا چمتکاری مخمس یہ ہے۔

پانی اپنے پائے بھلوں بھوجن تو دیجیے
آدمی نما وئے ششی ونڈوت کوڑے کیجیے
آپن گھاسے دام کام موہرینوں کریئے
آپ اگارے پر ان تے تنا دکھ ماں مریئے
گن کیڑے تو گن دس گنوں منواچا کرمے کریئے
اوگن کیڑے جن گن کوے تے جگ میں جیتو سہی

یعنی جو اپنے کو جل پان کرآئے اسے بھلا بھوجن تو دیجیے اور جو اپنے سامنے سر جھکائے اسے پرنام کیجیے۔ جو شخص تمہارا ایک پیسہ بھر کام کرے اس کے عوض میں ایک اشرفی بھر اس کا کام کرنے کی کوشش کریں جو آدمی تمہاری زندگی بچائے اس کی مصیبت کے وقت اولین مددگار رہیں۔ ایک کی بجائے دس گنا نیکی کریں اور دل سے چاہنے والوں کی ہمدردی میں دریغ نہ کریں اور برائی کرنے والے کی تعریف کریں۔ دراصل وہی دنیا کے فاتح ہیں جو نیک اعمال کرتے ہیں۔

■

بحوالہ: آپ بیتی مہاتما گاندھی

جشن مہاتما گاندھی

تین اقرار

1887 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت بمبئی اور احمد آباد دو امتحانات کے سنٹر تھے۔ ملک کے تو ایسے عام گھرانوں کی غربت کی یہ حالت تھی کہ میرے جیسے حالات کے کاٹھیاواڑی کو قریبی اور سستے احمد آباد کو پسند کرنا فطرتی تھا۔ راج کوٹ سے احمد آباد کا یہ میں نے پہلا سفر کیا تھا۔

بزرگوں کی یہ خواہش تھی کہ پاس ہو جانے پر آگے کالج میں پڑھوں۔ کالج بمبئی اور بھاؤنگر میں تھا لیکن کفایت شعاری کے خیال سے بھاؤنگر کے شامل داس کالج میں پڑھنے کا فیصلہ ہوا۔ وہاں ہر ایک کام مجھے مشکل معلوم ہونے لگا۔ پروفیسروں کے لیکچروں میں مجھے لطف نہیں ملتا تھا اور نہ ہی وہ سمجھ میں آتے۔ اس میں پروفیسروں کا قصور نہیں تھا بلکہ میری پڑھائی ہی کم تھی۔ اس وقت کے شامل داس کالج کے پروفیسر تو اعلیٰ درجہ کے خیال کیے جاتے تھے۔ چنانچہ ان حالات میں ہی پہلا ٹرم پورا کر کے گھر آیا۔

ہمارے قبیلے کے پرانے رفیق اور مشیر ایک ودوان اور سیانے برہمن ماؤجی دیو تھے۔ انھوں نے ہمیں مشورہ دیا۔ اب وہ زمانہ بدل گیا ہے تم بھائیوں میں سے اگر کوئی کابا گاندھی کی گدی لینا چاہے تو وہ تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ میری رائے ہے کہ موہن داس کو آپ اسی سال ولایت بھیج دیں۔ وہاں تین سال رہ کر بیرسٹر بن جائے گا اور پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیوں تمھیں ولایت جانا پسند ہے یا یہیں پڑھتے رہنا؟“

مجھے تو جو بھاوے وہی بتاوے۔ میں کالج کی مشکلات سے ویسے ہی تنگ آیا ہوا تھا۔ میں نے کہا ولایت بھیجیں تو بہت ہی اچھا ہوگا لیکن بڑے بھائی الجھن میں پڑ گئے۔ خرچ کا کیا انتظام ہوگا اور پھر اس عمر میں اتنی دور کیسے بھیج دیں۔

ماتا جی کو کچھ نہ سوجھا۔ دور بھیجنے کی بات انھیں پسند نہ آئی۔ اس نے ولایتی زندگی کے متعلق حالات دریافت کرنے شروع کیے۔ کوئی کہتا تھا نوجوان ولایت جا کر بگڑ جاتے ہیں۔ کوئی کہتا تھا گوشت کھاتے ہیں۔ کوئی کہتا وہاں شراب کے بغیر کام نہیں چلتا۔ ماں نے مجھے یہ سب باتیں سنائیں۔ میں نے سمجھایا کہ ''تم مجھ پر یقین رکھو۔ میں وشواس گھات نہیں کروں گا۔ قسم کھاتا ہوں کہ میں ان تینوں برائیوں سے بچا رہوں گا اور اگر ایسی مشکلات ہوئیں تو جوشی جی کیوں جانے کی صلاح دیتے،،

ماتا جی نے کہا ''مجھے تم پر یقین ہے لیکن دور دیش میں تیرا کیسے کیا بنے گا؟ میری تو عقل کام نہیں کرتی۔ میں بیچر جی سوامی سے دریافت کروں گی۔،،

بیچر جی سوامی موڑھ بنئے تھے۔ جو جین سادھو ہو گئے تھے۔ جوشی جی کی طرح وہ ہمارے صلاح کار بھی تھے۔ انھوں نے میری مدد کی۔ انھوں نے کہا۔ ''میں اس سے تین چیزوں کے لیے قسم لوں گا۔ پھر اس کے جانے میں کوئی ہرج نہیں ہوگا۔'' چنانچہ اسی کے مطابق میں نے گوشت، شراب اور عورتوں سے دور رہنے کی قسم دے دی۔

میرے ولایت جانے کی تقریب میں ہائی اسکول میں طالب علموں کی مجلس ہوئی۔ راج کوٹ کا ایک نوجوان ولایت جا رہا ہے۔ اس سے سب حیران تھے۔ میں کچھ جوابی تقریر لکھ کر لے گیا تھا مگر میں اسے مشکل سے پڑھ سکا۔ اتنا مجھے یاد ہے کہ سر چکرا رہا تھا اور بدن کانپ رہا تھا۔

■

بحوالہ: آپ بیتی مہاتما گاندھی

ماں کی عظمت

مرتبہ ماں کا ہے بیش قیمت
ان کو سمجھو ہمیشہ غنیمت
ماں کے دم سے یہ دنیا بھری ہے
پھر بھی عورت کی غارت گری ہے
'ماں' ہی عورت کی ہے اصل صورت
ہے سراپا محبت کی مورت
اس کے دل میں ریا ہے نہ نفرت
اس کا شیوہ نہیں ہے مضرّت
ماں سے منسوب ہے یہ عبارت
ان کی طینت سراپا طہارت
ماں ضعیفی میں بھی ہے تو ماں ہے
ایسی ہستی جہاں میں کہاں ہے
اس کے پاؤں کے نیچے ہے جنت
اس کی تصدیق کرتی ہے سنت

■

Mehnaz Bano
B.L. No.:4, H.No.:5
Kankinara - 24, PGS (N), West Bengal

فٹ بال ورلڈ کپ 2018

پیارے بچو! دنیا کا سب سے مقبول کھیل اور چار برسوں میں منعقد ہونے والا فٹ بال ورلڈ کپ جس کا شاندار اور جاندار اختتام 15 جولائی اتوار کو روس میں لزنیکی اسٹیڈیم میں اَسّی ہزار شائقین کی موجودگی میں جن میں کئی ملکوں کے صدور، وزرا، مشہور شخصیات تھیں، کے درمیان ہوا اور جسے ٹی وی کے پردے پر کروڑوں لوگوں نے دیکھا۔ اس کا آغاز 14 جون اور اختتام 15 جولائی اتوار کو ہوا۔ 32 ملکوں کی ٹیموں نے اس میں حصہ لیا۔ ہندوستان اتنا بڑا ملک ضرور ہے لیکن فٹ بال میں یہ 97ویں نمبر پر ہے۔ چند فٹ بال ماہرین کا کہنا ہے کہ 2026 میں جب 48 ٹیمیں شرکت کریں گی تب تک ہندوستان خوب محنت کر کے شاید شرکت کر سکے گا۔ ٹورنامنٹ شروع ہونے سے قبل 2014 کی فاتح ٹیم جرمنی ہی 2018 کے لیے بھی نمبر ایک کی پوزیشن کے لیے سب سے آگے تھی اور جن کھلاڑیوں کے نام پر فٹ بال شیدائی آنکھ لگائے بیٹھے تھے کہ وہی اپنی ٹیم کو نمبر ایک کا درجہ دلائیں گے ان میں صرف تین نام سب سے اوپر تھے اور وہ نام تھے ارجنٹینا کے لیونل میسی، پرتگال کے کرسٹیانو رونالڈو اور برازیل کے نیمار۔ روس کی حکومت نے فٹ بال مقابلوں کے لیے جو اسٹیڈیم لگاتار محنت کے سبب تین برسوں میں تعمیر کیے تھے وہ 60 ہزار سے 80 ہزار شائقین کے لیے تمام تر سہولتوں سے آراستہ تھے اور حفاظتی انتظامات بھی لائق

تحسین تھے۔

پیارے بچو! ہم جانتے ہیں کہ آپ میں سے بھی اکثر بچے جرمنی کی جیت کا اندازہ لگائے ہوئے تھے جو ابتدائی راؤنڈ میں ہار کر باہر ہوگئی۔ پھر تو ایسا ہوا کہ لیونل میسی کی ٹیم ارجنٹینا ہی ٹورنامنٹ سے باہر نہیں ہوئی۔ بلکہ رونالڈو کی ٹیم پرتگال، سوریز کی ٹیم اُرگوے بھی چلتی بنی۔ برازیل جیسی مضبوط ٹیم جس نے سب سے زیادہ دفعہ فٹ بال ورلڈ کپ حاصل کیا تھا۔ نیمار جیسے اسٹار کھلاڑی کے باوجود بلجیم سے ہار گئی اور مقابلے میں ایسی ٹیمیں باقی رہ گئیں جن کے بارے میں کسی نے بھی نہیں سوچا تھا۔

کوراٹر فائنل میں جو چار ٹیمیں جیت کر سیمی فائنل کھیلنے کی حقدار بنیں وہ تھیں بلجیم، فرانس، انگلینڈ اور کروشیا۔ فرانس نے بلجیم کو ہرا کر فائنل میں اپنی جگہ بنالی اور انگلینڈ کو ہرا کر کروشیا جیسی نئی نویلی ٹیم نے فائنل میں فرانس کے ساتھ کھیلنے کا ٹکٹ حاصل کرلیا۔ 14 جولائی کو تیسری پوزیشن کے لیے انگلینڈ اور بلجیم کا مقابلہ ہوا۔ انگلینڈ کا کیپٹن کین ٹورنامنٹ میں سب سے زیادہ 6 گول کر کے گولڈن بوٹ کا مضبوط دعوے دار نہ صرف بن چکا تھا بلکہ سب کو یقین تھا کہ وہ اور ایک دو گول کر کے اپنی ٹیم انگلینڈ کو تیسری پوزیشن دلاسکتا ہے۔ مگر بلجیم کے نوجوان کھلاڑیوں نے اس کی امید پر پانی پھیر دیا اور مقابلہ 2-0 سے جیت لیا۔ اب آخری مقابلہ فرانس اور کروشیا کے درمیان ہونا تھا اور 2018 ورلڈ کپ کا فاتح کون بنے گا۔ اس کا فیصلہ بس ہونے ہی والا تھا۔

ننھے ساتھیو! ایک طرف وہ مضبوط ٹیم تھی جو بیس برس قبل 1998 میں اپنے اُس کیپٹن ڈیس چیمپس کی شاندار کارکردگی میں اول انعام کی حقدار بنی تھی بلکہ جو آج بیس برس بعد اسی فرانس ٹیم کا کوچ بھی تھا۔ جس ٹیم کے کھلاڑی میں سات کھلاڑی مسلم تھے اور جن کے نام ہیں: میندی، عادل راجی، بول بوغبا، نغولو کانتی، جبریل سیدیبی، عثمان ویمیلی اور نبیل فقیر — دوسری طرف کروشیا جیسے چھوٹے ملک کی ٹیم تھی جس کی آبادی محض چالیس لاکھ تھی لیکن پورے ٹورنامنٹ میں اس نے اپنے جاندار کھیل کا مظاہرہ کیا تھا اور اپنی خاص شناخت بنالی تھی اس کا کیپٹن موڈرچ ہر فٹ بال شیدائی کی واحد امید تھا جس نے میسی، رونالڈو، سوریز اور نیمار جیسے نامور کھلاڑیوں کی موجودگی میں بھی خود کو نمایاں کیا تھا۔

آخر وہ 15 جولائی کا دن بھی آ گیا۔ فرانس کو پہلا گول 18ویں منٹ میں مل گیا۔ جو کروشیا کے ہی کھلاڑی کے پیر سے لگ کر جال میں چلا گیا۔ 28 ویں منٹ میں کروشیا کے نمبر 4 کھلاڑی نے شاندار گول کر کے مقابلے کو برابری پر لا کھڑا کیا۔ 38ویں منٹ میں فرانس کی جانب سے نمبر 7 کھلاڑی نے مقابلے کو 2-1 کر دیا۔ یہ تینوں گول دس دس منٹ کے فرق سے کیے گئے۔ انٹرول میں فرانس 2-1 سے آگے تھا۔ ہاف ٹائم کے بعد فرانس کے کھلاڑی نمبر 6 نے 58 ویں منٹ میں ایک اور گول داغ کر مقابلہ 3-1 کر دیا۔ 68 ویں منٹ میں فرانس کے گول کیپر کی غلطی کی وجہ سے کروشیا کے کھلاڑی نمبر 17 نے ایک گول کر کے مقابلہ 3-2 کر دیا۔

لیکن 66 ویں منٹ میں فرانس کے نئے ابھرتے ہوئے 19 سالہ کھلاڑی نے شاندار گول کرتے ہوئے اپنے گول کی تعداد 4 کر دی۔ یہ کھلاڑی تھا کاٹلیان ایمپابے جس نے عظیم فٹ بالر پیلے کا ریکارڈ بھی برابر کر دیا اور جسے ٹورنامنٹ کا سب سے عظیم کھلاڑی تسلیم کیا گیا۔ پیلے نے اسے مبارکباد دی۔

فیفا ورلڈ کپ فاتح فرانس کو 260 کروڑ روپے ملے۔ دوسری پوزیشن پر آئی سب سے چھوٹے ملک کروشیا کی ٹیم نے 192 کروڑ روپے حاصل کیے۔ وہیں بلجیم کی ٹیم نے تیسری پوزیشن حاصل کرتے ہوئے 164 کروڑ روپے کمائے اور انگلینڈ نے چوتھے نمبر پر آ کر 151 کروڑ پائے۔

تقسیم انعامات کا پروگرام جب شروع ہوا تو زوردار بارش ہونے لگی۔ ترتیب ایسی تھی کہ سب سے پہلے فیفا ورلڈ کپ صدر، دوسرے نمبر پر روس کے صدر جو ٹورنامنٹ کے میزبان بھی تھے۔ تیسرے نمبر پر فاتح ٹیم فرانس کے صدر اور چوتھے نمبر پر دوسری پوزیشن حاصل کرنے والی ٹیم کی صدر کولنڈا گ رابر تھیں۔ اس خاتون نے صدر فرانس کے ساتھ میدان میں داخل ہونے کے بعد اور انعامات حاصل کرنے والے کروشیا کے سارے کھلاڑیوں کو گلے لگا کر مبارکباد دی اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اسی طرح اس نے فرانس کے بھی تمام کھلاڑیوں کا اسی پرجوش انداز میں خیر مقدم کیا۔ بتایا گیا ہے کہ بلا معاوضہ رخصت لے کر، ذاتی خرچ پر فضائی سفر کے بعد روس کے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ فرانس نے بھلے ہی فاتح بن کر تاریخ رقم کی ہے لیکن کروشیا نے سب شیدائیوں کے دل جیتے ہیں۔ جبکہ کروشیا کے کیپٹن ماڈرچ نے گولڈن بال کا انعام بھی حاصل کیا ہے۔ 32 ملکوں کی ٹیموں میں جاپان نے بھی شیدائیوں کا دل جیتا۔ انھوں نے وہاں صفائی مہم کا بھی مظاہرہ کیا۔ برازیل میں جگہ جگہ کھلاڑیوں کی ناکامی کے خلاف مظاہرے کیے گئے جبکہ بلجیم، کروشیا اور فرانس کے شہروں میں آتش بازی کی گئی۔ فرانس کے کھلاڑیوں اور کوچ کو انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ روس کے صدر ولادیمیر پوتن نے اگلے ورلڈ کپ کی میزبانی کرنے والے دنیا کے چھوٹے ترین ملک قطر کے شیخ تمیم بن حماد سے خصوصی ملاقات کرتے ہوئے انھیں عالمی کپ کی مشعل دی۔ پیارے بچو! یاد رہے کہ قطر کی آبادی محض 23 لاکھ ہے جہاں 2022 کا فٹ بال ورلڈ کپ ٹورنامنٹ ہوگا۔ اس فٹ بال ورلڈ کپ کی کامیابی پر اور بہتر انتظامات کے لیے روس کی بے حد تعریف و توصیف کی گئی۔

■

Malik Bazmi
C/o Shafee Ahmed Shafee
Opp: Metro Foot Wear
Bhoi Galli, Po: Distt:
Parbhani - 431401 (Maharashtra)

فرح دیبا

یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں انگلینڈ کا عالمی ریکارڈ

آسٹریلیا کے خلاف ناٹنگھم میں 19 جون 2018 کو کھیلے گئے تیسرے یک روزہ بین الاقوامی میچ میں انگلینڈ کے بلے بازوں نے شاندار بلے بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے 50 اوور میں چھ وکٹ پر 481 رن بنائے جو یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں کسی بھی ٹیم کا سب سے زیادہ اسکور ہے۔ اس میچ میں انگلینڈ نے جس طرح کھیل کی ابتدا کی تھی اس سے لگ رہا تھا کہ وہ یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں پانچ سو کا ہندسہ پار کرنے والی پہلی ٹیم بن جائے گی۔

اس سے پہلے یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں سب سے زیادہ اسکور کرنے کا ریکارڈ انگلینڈ کے پاس ہی تھا جس نے پاکستان کے خلاف اسی میدان پر 30 اگست 2016 کو 50 اوور میں تین وکٹ پر 444 رن بنائے تھے۔ یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں تین سو رن بنانے والی پہلی ٹیم انگلینڈ تھی جس نے ہندوستان کے خلاف لارڈز میں 7 جون 1975 کو 60 اوور میں 4 وکٹ پر 334 رن بنائے تھے۔

یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں تین سو رنوں سے زیادہ کا 9 مرتبہ عالمی ریکارڈ قائم ہوا ہے۔

پاکستان نے سری لنکا کے خلاف سوانسی میں 60 اوور میں 5 وکٹ پر 338 رن بنا کر عالمی ریکارڈ اپنے نام کیا تھا۔ پاکستان نے عالمی کپ کے میچ میں عالمی ریکارڈ بنایا تھا اور عالمی کپ کے میچ میں ہی یہ ریکارڈ ٹوٹا۔ ویسٹ انڈیز نے کراچی میں 13 اکتوبر 1987 کو کھیلے گئے میچ میں 50 اوور میں 4 وکٹ پر 360 رن بنا کر یہ ریکارڈ اپنے نام کیا تھا۔ اس سے پہلے ہندوستان کے خلاف جمشید پور میں 7 دسمبر 1983 کو ویسٹ انڈیز نے 455 اوور میں 8 وکٹ پر 333 رن بنائے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب 60 اوور سے کم اننگ میں 300 کا ہندسہ پار

ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں بڑے اسکور

اسکور	ٹیم	بہ مقابلہ	بہ مقام	بہ تاریخ
481، 6 وکٹ پر	انگلینڈ	آسٹریلیا	ناٹنگھم	19 جون 2018
444، 3 وکٹ پر	انگلینڈ	پاکستان	ناٹنگھم	30 اگست 2016
443، 9 وکٹ پر	سری لنکا	ہالینڈ	ایمسٹلوین	4 جولائی 2006
439، 2 وکٹ پر	جنوبی افریقہ	ویسٹ انڈیز	جوہانسبرگ	18 جنوری 2016
438، 9 وکٹ پر	جنوبی افریقہ	آسٹریلیا	جوہانسبرگ	12 مارچ 2006
438، 4 وکٹ پر	جنوبی افریقہ	ہندوستان	بمبئی	25 اکتوبر 2015
443، وکٹ پر	آسٹریلیا	جنوبی افریقہ	جوہانسبرگ	12 مارچ 2006
418، 5 وکٹ پر	جنوبی افریقہ	زمبابوے	پوٹچیف اسٹروم	20 ستمبر 2006
418، 5 وکٹ پر	ہندوستان	ویسٹ انڈیز	اندور	8 دسمبر 2011
417، 6 وکٹ پر	آسٹریلیا	افغانستان	پرتھ	4 مارچ 2015

کیا گیا تھا۔ ویسٹ انڈیز کا سب سے بڑا اسکور بنانے کا ریکارڈ لگ بھگ پانچ سال تک قائم رہا۔ 20 اگست 1992 کو پاکستان کے خلاف ناٹنگھم میں کھیلے گئے میچ میں انگلینڈ نے 555 اوور میں 7 وکٹ پر 363 رن بنا کر عالمی ریکارڈ اپنے نام کیا۔

کینڈی میں کینیا کے خلاف 1996 کے عالمی کپ میں سری لنکا نے 50 اوور میں 5 وکٹ پر 398 رن بنا کر عالمی ریکارڈ پر قبضہ کیا تھا۔ 6 مارچ 1996 کو کھیلے گئے اس میچ میں اگر میزبان ٹیم دو اور رن بنا لیتی تو یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں 400 رن بنانے والی پہلی ٹیم بن سکتی تھی۔

یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں چار سو رن بنانے والی پہلی ٹیم آسٹریلیا تھی جس نے جنوبی افریقہ کے خلاف جوہانسبرگ میں 12 مارچ 2006 کو کھیلے گئے میچ میں 50 اوور میں 4 وکٹ پر 434 رن بنائے تھے۔

آسٹریلیا کا یہ ریکارڈ چند گھنٹوں تک ہی قائم رہ سکا۔ کیونکہ جنوبی افریقہ نے 49.5 اوور میں 9 وکٹ پر 438 رن بنا کر نہ صرف ایک وکٹ سے میچ جیتا بلکہ وہ یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں بھی سب سے زیادہ اسکور بنانے میں کامیاب رہی۔

ہالینڈ کے خلاف ایمسٹلوین میں 4 جولائی 2006 کو سری لنکا نے 50 اوور میں 9 وکٹ پر 443 رن بنا کر یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں سب سے بڑا اسکور بنانے کا اعزاز

حاصل کیا۔

سری لنکا کا یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں سب سے بڑا اسکور بنانے کا ریکارڈ دس سال سے کچھ زیادہ عرصے تک قائم رہا۔ 30 اگست 2016 کو ناٹنگھم میں پاکستان کے خلاف انگلینڈ نے 50 اوور میں 3 وکٹ پر 444 رن بنا کر سب سے بڑے اسکور کا ریکارڈ اپنے نام کیا۔ اس نے اپنے اس ریکارڈ کو آسٹریلیا کے خلاف 19 جون 2018 کو اسی میدان پر 50 اوور میں 6 وکٹ پر 481 رن بنا کر بہتر کیا۔

انگلینڈ کا یہ اسکور یک روزہ کرکٹ میں دوسرا سب سے بڑا اسکور ہے۔ انگلینڈ کی کاؤنٹی سرے کو اس قسم کے کرکٹ میں سب سے زیادہ اسکور کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس نے گلوسٹر شائر کے خلاف اُوول میں 29 اپریل 2007 کو 50 اوور میں 4 وکٹ پر 496 رن بنائے تھے۔ ہندوستان اے نے لیسٹر شائر کے خلاف لیسٹر میں 19 جون 2018 کو 50 اوور میں 4 وکٹ پر 458 رن بنائے تھے۔ ہندوستان کی اے ٹیم کا یک روزہ کرکٹ میں سب سے بڑا اسکور بنانے کا ریکارڈ چند گھنٹے قائم رہا تھا کیونکہ انگلینڈ نے اسی روز 50 اوور میں 6 وکٹ پر 481 رن بنائے۔ ہندوستان اے ٹیم کے اسکور کو تیسرے مقام پر کر دیا تھا۔

یک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میں ابھی تک 19 مرتبہ 400 سے زیادہ رن بنے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں سب سے زیادہ یعنی 6 مرتبہ ایسا کیا گیا ہے۔ ہندوستان نے پانچ اور انگلینڈ نے تین مرتبہ 400 سے زیادہ رن بنائے ہیں۔ آسٹریلیا اور سری لنکا نے دو دو مرتبہ اور نیوزی لینڈ نے ایک مرتبہ ایسا کیا ہے۔

■

Dr. Farah Deeba
2027 Ahata Kalay Sahab
Qasim Jan Street
Delhi - 110006

غوثیہ سعیدہ

کہانی

ایک کہانی نانی کی زبانی
نافرمانی کی سزا

عائشہ 7 سال کی لڑکی تھی وہ بہت ہی ہوشیار، چالاک، سمجھدار اور نیک لڑکی تھی۔ اس کا بھائی ابوبکر اس سے 1 سال بڑا تھا اور ایک چھوٹی بہن اسما تھی۔ یہ تینوں اپنے ماں باپ کے چہیتے تھے۔ وہ ہر سال اپنی اسکول کی چھٹیوں میں اپنے ننیہال جاتے تھے۔ وہاں اس کے ماموں کے دو بچے خدیجہ اور نصیبہ جو عائشہ سے چھوٹی تھیں ان کے ساتھ کھیلنے اور ان کو نانی کی کہانیاں سنانے کے لیے سب کو بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔ اس سال بھی انھیں بے صبری سے اپنی چھٹیوں کا انتظار تھا کیونکہ ان کی نانی کی کہانی میں نصیحتیں ہوتی تھیں۔ اچھی اور مزیدار باتیں ہوتی تھیں۔ اس سال نانی نے کہانی اس طرح شروع کی:

ایک گاؤں میں ایک بوڑھا کسان رامو اور اس کی بیوی سیتا رہتی تھیں۔ رامو کو گاؤں کے بچے کاکا اور اس کی بیوی کو کاکی کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ بوڑھا اور بوڑھی اپنی جھونپڑی اور کھیتی میں بہت خوش تھے اور گاؤں کے لوگ بھی ان سے بہت محبت سے رہتے تھے۔ صبح ہوتے ہی کھیتی کے کاموں میں لگ جاتا تھا اور سیتا کاکی پالتو جانوروں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ ان کے گھر میں ایک سفید رنگ کی مرغی تھی وہ ہر دن ایک انڈا دیتی تھی۔ سیتا اس کو بڑی حفاظت سے سنبھال کر رکھتی۔ مرغی 15 یا 16 انڈے دینے کے بعد تھک جاتی۔ جس جگہ پر وہ انڈا دیتی اسی جگہ پر وہ بیٹھ جاتی تو سیتا ایک مٹی کے برتن میں راکھ بھر کر اس پر انڈوں کو جمع

کہانی

کر دیتی اور مرغی کو اس پر بٹھا دیتی۔ ہر دن مرغی کو چارہ اور پانی دیتی تھی۔ انڈوں میں مرغی سے گرمی پہنچتی ہے جسے ہم انڈے سینکنا کہتے ہیں اسی طرح جب 21 دن پورے ہوئے تو ایک کے بعد ایک چوزے نکل پڑے جس میں رنگ برنگے 15 چوزے نکل آئے اور ایک انڈا خراب ہوگیا۔ 23 دن تک پورے چوزے نکل جاتے۔ ان چوزوں میں کچھ سفید رنگ کے بھی چوزے تھے، مرغی ان چوزوں کو دیکھ کر بہت خوش تھی۔

سیتا ہر دن ان چوزوں کو گرم پانی چاول کے دانے باریک کرکے یا باجرہ راگی وغیرہ ہلدی اور لہسن ملا کر ان کو رکھتی اور جب شام ہوجاتی اندھیرا چھا جاتا تو مرغی اپنے دونوں بازوؤں کے پروں ہی سے سارے بچوں کو سمیٹ لیتی اور وہ بچے خاموشی سے اس کے پروں میں چھپ کر سوجاتے۔ مرغی اپنے بچوں کو بہت ہی حفاظت سے پالتی تھی۔ وہ اپنی جان سے بھی زیادہ اپنے بچوں کو چاہتی تھی۔ کوئی بھی دوسری مرغی پاس نہیں آتی کہ کہیں کوا، چیل، یا شکرا آکر ان چوزوں کو اٹھا کر نہ لے جائے۔ ان کی حفاظت کرتی، کوے کو ڈرانے کے لیے یہ بھی کچھ اوپر اڑتی اور بھگا کر واپس آتی۔ کچھ دن بعد مرغی چوزوں کو لے کر باہر نکلی۔ اس کے گھر کے بازو میں ایک کنواں تھا جس کی دیوار نہیں تھی۔ مرغی نے اپنے بچوں سے کہا کہ اس کنویں کے قریب مت جانا۔ وہاں خطرہ ہے۔ سارے چوزے اپنی ماں کی بات مان کر ماں کے ساتھ ہی گھومتے پھرتے تھے لیکن ان میں ایک چوزہ بہت شریر تھا، اس کے دل میں شرارت سوجھی، اس نے سوچا کہ میں خود جا کر دیکھتا ہوں کہ آخر اس کنویں کے قریب کیا ہے۔ جوں ہی یہ آگے بڑھتا گیا اس کی ماں اسے بلا رہی تھی۔ اُدھر مت جاؤ، آجاؤ واپس آجاؤ لیکن اس نے ماں کی بات نہیں سنی۔ جوں ہی وہ آگے بڑھا مٹی گری اور مٹی کے ساتھ چوزہ بھی گر پڑا۔ مرغی بے چاری آخر کیا کرتی۔ چوزہ کنویں کے پانی میں گر پڑا اور اسے اپنی جان گنوانی پڑی۔

جو نہ سنے گا ماں کی نصیحت
پچھتائے گا دن و رات

عائشہ کی نانی نے کہانی ختم کرکے کہا اگر اس چوزے نے اپنی ماں کی نصیحت سنی ہوتی تو اسے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ ماں کی نصیحت ضرور سنیں، ماں اپنے بچوں کا بھلا چاہتی ہے۔ ماں اپنے بچوں کا کبھی برا نہیں چاہتی۔ انسان تو انسان جانور بھی اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔

■

Dr. Ghousya Sayeeda
Hakeem S.A. Syed Sathar
Parbhani Vaidyasala
Royapetth,
Chennai - 600014 (Tamil Nadu)

بچوں کی دنیا

آخری قسط

قسط وار ناول

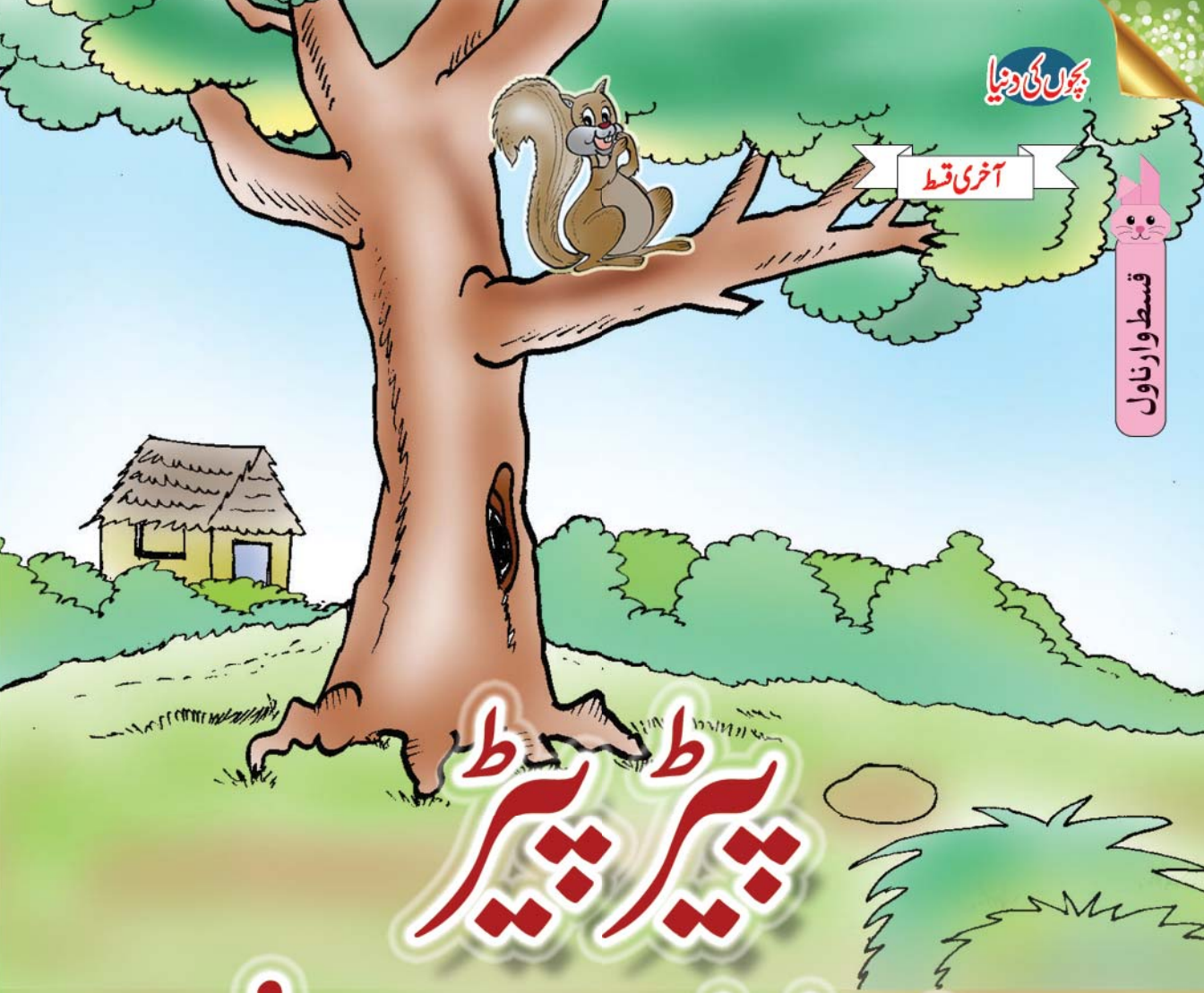

پیر پیر میرا دانہ دے!

مصنف: سید غلام حیدر

مصور: ایف آئی فیضی

اور پانی نے دیکھا ____ کہ:

آگے آگے ہاتھی اور ہاتھی کے پیچھے چیونٹی اور چیونٹی کے پیچھے کٹّو چلے آرہے ہیں۔

تو پانی سمجھ گیا ____ پانی ہاتھی سے ڈر گیا۔

اور وہ چلا آگ کی طرف ____

اور جب آگ نے دیکھا کہ:

آگے آگے پانی، پانی کے پیچھے ہاتھی، ہاتھی کے پیچھے چیونٹی اور چیونٹی کے پیچھے کٹّو تو آگ ساری بات سمجھ گئی۔ آگ پانی سے ڈر گئی۔

اور وہ چلی ڈنڈے کی طرف ____

اور ڈنڈے نے جو دیکھا کہ:

آگے آگے آگ، آگ کے پیچھے پانی، پانی کے پیچھے ہاتھی، ہاتھی کے پیچھے چیونٹی، اور چیونٹی کے پیچھے کٹّو تیز تیز آرہے ہیں تو ڈنڈا

سب کچھ سمجھ گیا ____ وہ آگ سے ڈر گیا

اور پھر ڈنڈا چلا بلی کی طرف ____

اب جو بلّی نے دیکھا کہ:

آگے آگے ڈنڈا، ڈنڈے کے پیچھے آگ، آگ کے پیچھے پانی، پانی کے پیچھے ہاتھی، ہاتھی کے پیچھے چیونٹی، چیونٹی کے پیچھے کٹّو چلے آرہے ہیں تو بلّی سمجھ گئی ____ بلّی ڈنڈے سے ڈر گئی ____

اور وہ لپکی چوہیّا کو پکڑنے۔

پھر جب چوہیّا نے دیکھا ____ کہ:

آگے آگے بلّی، بلی کے پیچھے ڈنڈا، ڈنڈے کے پیچھے آگ، آگ کے پیچھے پانی، پانی کے پیچھے ہاتھی، ہاتھی کے پیچھے چیونٹی، چیونٹی کے پیچھے کٹّو دوڑتے چلے آرہے ہیں، تو چوہیّا سب کچھ سمجھ گئی ____ اسے بلّی سے بہت ڈر لگا اور بس وہ بھاگی رانی کے کپڑے کاٹنے۔

اب جو رانی نے دیکھا کہ:

آگے آگے چوہیّا، چوہیّا کے پیچھے بلی، بلی کے پیچھے ڈنڈا، ڈنڈے کے پیچھے آگ، آگ کے پیچھے پانی، پانی کے پیچھے ہاتھی، ہاتھی کے پیچھے چیونٹی اور چیونٹی کے پیچھے کٹّو اس کے کپڑوں کی طرف لپک رہے ہیں تو وہ ساری بات سمجھ گئی ____ رانی چوہیّا سے ڈر گئی۔

اور وہ چلی راجہ سے روٹھنے۔

•

راجہ نے جو دیکھا کہ:

آگے آگے رانی، رانی کے پیچھے چوہیّا، چوہیّا کے پیچھے بلّی، بلّی کے پیچھے ڈنڈا، ڈنڈے کے پیچھے آگ، آگ کے پیچھے پانی، پانی کے پیچھے ہاتھی اور ہاتھی کے پیچھے چیونٹی، چیونٹی کے پیچھے کٹّو تیز تیز چلے آرہے ہیں ـــــ تو راجا کو ساری بات یاد آگئی ـــــ تو وہ گھبرا گیا اور وہ اٹھا سپاہی کو نکال دینے کے لیے ۔

•

اب سپاہی نے جو دیکھا کہ:

آگے آگے راجا، راجا کے پیچھے رانی، رانی کے پیچھے چوہیّا، چوہیّا کے پیچھے بلّی، بلّی کے پیچھے ڈنڈا، ڈنڈے کے پیچھے آگ، آگ کے پیچھے پانی، پانی کے پیچھے ہاتھی، ہاتھی کے پیچھے چیونٹی اور چیونٹی کے پیچھے کٹّو دوڑے چلے آرہے ہیں تو وہ ڈرا ـــــ اور وہ چلا بڑھئی کو پکڑنے ۔

•

اور بڑھئی سمجھ گیا کہ:

سب سے آگے سپاہی، سپاہی کے پیچھے راجا، راجا کے پیچھے رانی، رانی کے پیچھے چوہیّا، چوہیّا کے پیچھے بلّی، بلّی کے پیچھے ڈنڈا، ڈنڈے کے پیچھے آگ، آگ کے پیچھے پانی، پانی کے پیچھے ہاتھی، اور ہاتھی کے پیچھے چیونٹی اور چیونٹی کے پیچھے کٹّو کیوں دوڑے چلے آرہے ہیں۔

اور بس اس نے اٹھائی کلہاڑی ـــــ اور چلا پیڑ کی طرف ـــــ

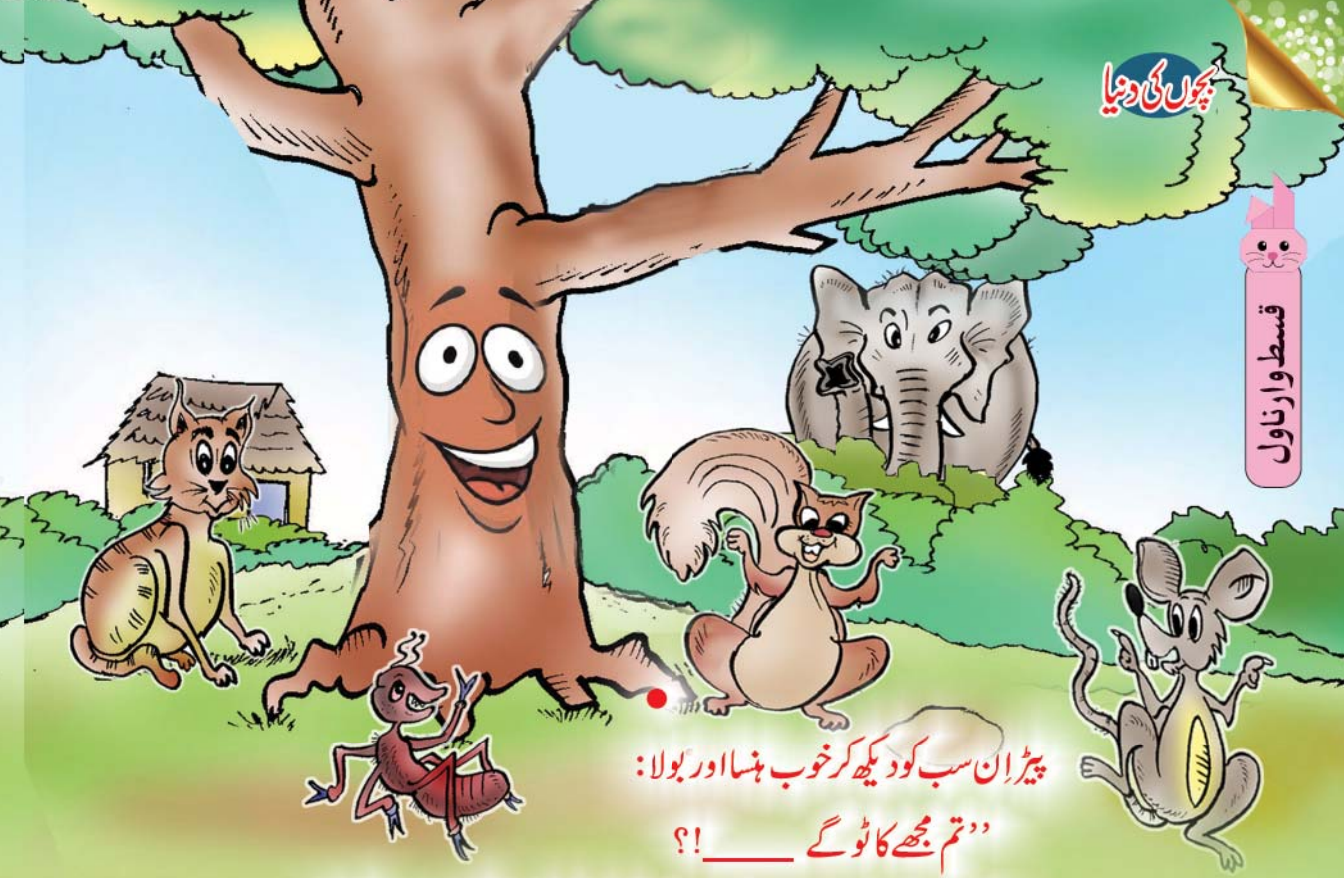

پیڑ اِن سب کو دیکھ کر خوب ہنسا اور بولا:

''تم مجھے کاٹو گے ____!؟

میں کٹ گیا تو ____ گرمی میں ٹھنڈا ٹھنڈا سایہ کون دے گا؟

بارش کیسے ہوگی؟

پھول پھل کہاں سے آئیں گے؟

چیڑیاں، طوطے اور بندر کہاں رہیں گے؟

تم مجھے مت کاٹو ____ میں تو سب کے کام آتا ہوں!''

''تو پھر پیڑ پیڑ میرا دانہ دے ____!'' کٹّو نے جلدی سے کہا

اور پیڑ نے فوراً چنے کا دانہ زمین پر گرا دیا۔

پھر سب خوش ہو گئے۔ پیڑ کے ٹھنڈے سایے میں ناچنے لگے۔

____ پیڑ جھوما، کٹّو ناچی، ہاتھی اُچھلا، بلی کودی، چوہیّا پھُدکی ____

اور پھر سب خوش خوش خوش اپنے گھر چلے گئے۔

پہلی قسط

قسط وار ناول

شہر میں ایک جنگل

مصنف: کمارن ست سیوم
مترجم: عباس آصف

قسط وار ناول

پیارے دوستو! آپ نے بچوں کی دنیا میں کئی اچھے اور مشہور ناولوں کو پڑھا ہے۔ اب ہم اس ماہ سے ایک نیا سلسلہ 'شہر میں ایک جنگل' شروع کررہے ہیں۔ اِس کے مصنف کمارن ستیہ سیوم ہیں جو ماحولیات اور جنگلاتی زندگیوں پر لکھتے رہے ہیں۔ ان کی کتاب میرین میمل آف انڈیا بھی کافی مقبول ہوئی تھی۔ انھوں نے 1990 میں یہ کتاب Forest in the City لکھی تھی۔ اِس کتاب کو ماحولیات پر بچوں کے لیے لکھی کتابوں پر پہلا انعام بھی دیا گیا تھا۔ کمارن ستیہ سیوم آئی آئی ٹی مدراس (چنئی) میں سات برسوں تک رہے تھے۔ آئی آئی ٹی اس وقت 600 ایکڑ سے بھی زیادہ کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا اور زیادہ تر گھنے جنگلوں پر مشتمل تھا۔ کمارن ستیہ سیوم نے ان جنگلوں میں مختلف تجربات کیے تھے اور ان تجربات کو ہی کتابی شکل دی تھی جسے بچو ں کی دنیا میں پیش کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

تین کناروں والی جھیل

ابھی مارچ کا مہینہ ہی لگا تھا مگر موسم بے حد گرم ہو چکا تھا۔ اب ایسا سوچنا بھی محال تھا کہ صرف چند ہفتوں قبل، ماہ جنوری میں اس قدر سہانا موسم تھا۔ دراصل اس دوران راتیں خاصی سرد ہوجاتی تھیں۔ فروری میں واضح طور پر ہر جگہ دن گرم ہونے لگے تھے اور سورج ناخوش گوار حد تک سیدھے زاویے سے کرنیں ڈال رہا تھا۔ مارچ کے مہینے میں گرم موسم کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ اس طرح گرمیاں شروع ہونی باقی تھیں۔ فضا اس قدر مرطوب تھی کہ ہوا میں ایک طرح کی چپچپاہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔

ہم کسی طرح موسم سے تال میل بنائے ہوئے اپنی ڈرائنگ کے کام کو مکمل کرنے میں مصروف تھے۔ اسے دو ماہ کی مدت میں مکمل کیا جانا تھا۔ جوزف سامنے بیٹھا اپنی میز پر کچھ شکلیں بنا رہا تھا۔ اس کے پیچھے کی جانب وینکٹیش بیٹھا ہوا خلا میں نظریں جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔ مجھے بھی اپنے کام کی وجہ سے سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ مجھے ایک خط منحنی بنانا تھا۔ اس کے لیے ایک لمبی پلاسٹک کی پٹی اور لوہے کے کئی باٹوں کا استعمال کرنا تھا تاکہ خط منحنی یہ پٹی اپنی جگہ نہ کھسکے۔ جب میں اس پٹی کو موڑ کر درکار شکل بنانے کی کوشش کرتا تو کوئی وزن اپنی جگہ سے اچھل کر الگ جا پڑتا اور اسی جگہ یہ پٹی اپنی جگہ سے ہٹ جاتی۔ مجھے پھر سے ساری کارروائی کرنی پڑتی۔ پوری توجہ سے کام لیتے ہوئے میں نے بڑی محنت اور بہ ہزار دقت، درکار نشانات پر پٹی کو رکھا۔ پلاسٹک کی پٹی اپنی جگہ سے نہ کھسکے اس لیے میں نے اس پر بہت سے باٹ رکھے۔ جیسے ہی میں نے آخری وزن کو صحیح جگہ پر رکھا، تو یہ پٹی دو ٹکڑے ہوگئی۔ میں نے

کھسیا کر اپنی پنسل پھینک دی اور وینکٹیش اور جوزف کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا۔ وینکٹیش اب بھی اپنے خیالوں میں گم تھا تاہم جوزف نے خراٹے لینے شروع کر دیے تھے۔ جوزف مشکل ترین حالات میں سو جایا کرتا تھا۔ میں نے ممبئی کی مضافاتی ریل گاڑیوں میں اسے ہینڈل پر خطرناک ڈھنگ سے لٹک کر سفر کرنے کے دوران بھی سوتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے اسے کینٹین میں لائن میں کھڑے ہوئے کلاس میں موضوع کے غیر دلچسپ ہونے کی صورت میں سوتے ہوئے دیکھا ہے۔

دراصل جوزف کلاس میں اس طرح سے سو جاتا تھا کہ ہم اسے اپنی کنکھیوں سے دیکھا کرتے تھے اور لیکچر جاری رہتا تھا۔ اس وقت جوزف کا سر، بکھرے ہوئے بالوں والے چہرے کے ساتھ جھکولے لیتا گویا استاد کی بات پر ہاں میں سر ہلا رہا ہو اور پھر ایک جانب کندھے پر ڈھلک جاتا۔ کئی بار وہ سنبھلنے کی کوشش کرتا پھر آخر میں ناکام ہو کر ایک بازو کا سہارا لے کر ڈیسک پر اوندھ جاتا۔ اس دوران اس کا دوسرا ہاتھ جس میں قلم دبا ہوتا، نوٹ بک پر نشان بناتا رہتا اور آخر کار یہ ہاتھ بھی ساکت ہو جاتا۔ جوزف کی نوٹ بک میں جا بجا ایسی تحریریں نظر آتیں جنھیں پڑھنا ممکن نہ ہوتا۔ ٹیڑھی ترچھی لکیریں، پھر سیدھی سطر، یہ بتاتیں کہ وہ نیند سے لڑتے ہوئے جنگ کہاں پر ہارا تھا۔

اب وہ اپنی میز پر اوندھا سو رہا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہم سب اپنی مصروفیات ترک کر دیتے۔

''جوزف جنگل میں ایک چکر لگانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جوزف، جوزف'' میں جوزف کے کانوں میں چلایا۔

''ہوں! ہم؟ کیا کوئی جنگل میں گھومنے کی بات کہہ رہا تھا؟'' جوزف نے اپنی نیند سے لڑتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، اور یہ میرے ذہن کی اپج ہے، کیا تم اس میں دلچسپی لو گے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ارے ہاں کیوں نہیں ہم کو ابھی چل دینا چاہیے! میرا خیال ہے کہ جھیل کی جانب ہے نا؟'' جوزف نے اپنی اونگھتی پلکوں کو زبردستی پھیلا کر کہا اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

وینکٹیش معجزانہ طور پر ہوش میں آ گیا اور پرزور انداز میں جنگل کی سیر کی تائید میں سر ہلانے لگا۔ وینکٹیش اکثر بات نہ کرنے کی خواہش پر قابو پانے کے لیے خود کلامی بھی کرنے لگتا تھا۔

لہٰذا ہم نے جلدی سے ڈرائنگ ہال سے باہر قدم نکالا، ہمارے پیچھے ہمارے دیگر ہم جماعت ہمیں ایسی نظروں سے گھور رہے تھے کہ ہمیں سمجھنا ان کے لیے ٹیڑھی کھیر ہے کیونکہ انھیں ہماری طرح فطرت، جنگل کے جانوروں اور بیرونی دنیا کے دیگر امور سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ہم نے اسٹیڈیم تک کا مختصر سفر سائیکلوں پر طے کیا جہاں ہم نے سائیکلیں برگد کے درخت کے سائے میں چھوڑ دیں۔ ہم نے ایک چھوٹا سا پل جو کنکریٹ سے تعمیر ہوا تھا، پار کیا۔ یہ پل اسی جھیل کے ایک دلدلی حصے پر بنا ہوا تھا جس کے کنارے ہم جانے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔

جوزف داڑھی رکھے ہوا تھا۔ وہ قدرے آگے جھک کر بڑی آسانی سے چلتا تھا۔ اس وقت وہی سب سے آگے تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وینکٹیش میرے ساتھ تھا تاہم اس کی پتلی ربڑ کی سلیپر اس جھاڑیوں والے من چلے سفر کے لیے قدرے نامناسب تھیں!

چھوٹے پل سے گزر کر ہم ایک چھوٹے سے مندر کے

نزدیک پہنچ گئے اس کی پشت پر گھنا جنگل تھا جو جھیل کے کنارے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہم نے مندر کے کنارے فٹ پاتھ کو اپنا راستہ بنا کر جنگل کی راہ پکڑی۔

گرد و پیش میں یکا یک تبدیلی آچکی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم بالکل مختلف دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ درختوں اور سائے دار پتوں کی چھتری والی دنیا اور قدموں کے نیچے ہری بھری گھنی گھاس۔ اب انسانی دنیا اپنے تمام تر شور و شر، گاڑیوں کی چیخ، لاؤڈ اسپیکروں کے شور کے ساتھ پیچھے بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

ایک سنجیدہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم ہوا کے اثر سے بانسوں کے رگڑ کھانے اور پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے پیدا ہونے والی آواز، جھینگر کی تیکھی اور کسی بچھڑے پرندے کی آواز کے فرق سے بھی واقف تھے۔ اچانک اس شور سے بھری ہوئی دنیا کو چھوڑ کر اس دنیا میں قدم رکھنے سے ہم پر سب سے پہلا یہ اثر ہوا کہ ہم نے آپس میں گفتگو بند کر دی۔

ہم نے ایک قطار سی بنالی اور ہماری کوشش یہ تھی کہ ہماری چال سے کم سے کم آواز پیدا ہو، ہم بڑی نرمی سے قدم رکھ رہے تھے تاکہ جنگل کی خاموشی متاثر نہ ہو۔ ہماری آنکھیں، ہمارے کان ہر حرکت اور ہر آواز کو سننے اور سمجھنے کے لیے تیار تھے۔ ہماری نظریں جھاڑیوں اور درختوں پر تھیں۔ ہم آہستہ آہستہ قدموں سے ڈھال دار راستے پر چڑھتے گئے۔

آگے جا کر اچانک زمین غیر سطح ہوگئی اور ایک طویل ٹیڑھا میڑھا کنارہ ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ گھنی جھاڑیوں کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا تھا اور ہم دور تک پانی پر نظر ڈال سکتے تھے۔ یہ جھیل ہم نے اور جوزف نے ایک دن ابتدائی دنوں میں دوپہر بعد کی مہم جوئی میں دریافت کی تھی۔ ایک پرجوش اناڑی فطرت پسند گروہ کے لیے یہ ایک پرکشش مقام تھا۔ یہاں ہمارے لیے قدرت نے گوناگوں دلچسپیوں کے زندہ خزانے بکھیر رہے تھے۔ یہ جھیل ہمیشہ ہمیں کچھ نہ کچھ نیا احساس دلایا کرتی تھی۔ خواہ ہم کبھی بھی آئیں یہاں کوئی نہ کوئی چیز غیر متوقع طور پر دریافت ضرور ہو جایا کرتی تھی۔ بعد ازاں جب ہم اس جگہ سے زیادہ مانوس ہوگئے تب بھی ہمارا احساس یہی رہا۔ اکثر اونگھتی دوپہر میں ہم اپنے ڈرائنگ ہال سے بھاگ

کر یہیں پناہ لیا کرتے تھے۔

نیچے پانی کے کناروں پر ایک خوبصورت چتّیوں والا بارہ سنگھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہماری آوازیں تو یقیناً سنیں مگر جھاڑیوں کے اندھیرے میں وہ ہمیں دیکھ نہ سکا۔ وہ وہاں تن کر کھڑا تھا۔ اس کے سہ شاخہ سینگ اور خوشنما سر اور زیادہ شاندار لگ رہے تھے۔ دفعتاً اس نے ہماری سمت قدم بڑھائے۔ گویا یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر ہم لوگ ہیں کون اور کہاں ہیں۔

ہمیں دیکھ لینے کے بعد وہ متعجب ہو کر اپنی جگہ جم سا گیا۔ وینکٹیش نے تیز رنگ والی شرٹ پہن رکھی تھی جس پر 'ہیلو' تحریر تھا۔ اس نے اپنی باہیں پھیلائیں اور انھیں ہوا سے چلنے والی چکی کے پروں کی طرح گردش دینے لگا۔ یہ نظارہ دیکھ کر ہرن گھبرا کر پانی میں کود گیا اور بڑی تیزی سے پانی اچھالتا ہوا جھیل کے دوسری جانب نکل بھاگا اور جلد ہی نظروں سے غائب ہو گیا۔

اس جھیل کے کنارے ہرن، بونٹ بندر (Bonnet Monkeys) اور نیولے اکثر نظر آتے تھے تاہم ہمیں سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا وہ یہاں پائی جانے والی مختلف اقسام کی چڑیاں تھیں۔ جب بھی یہاں آتے، ہمیں کوئی نہ کوئی نیا پرندہ نظر آتا۔

اس دوپہر بھی ہم کو مایوسی نہیں ہوئی۔ ہم نے ایک تناور انجیر کا درخت دیکھا جو ٹھیک پانی کے کنارے اگا ہوا تھا۔ یہاں سے ہم پوری جھیل کا نظارہ کر سکتے تھے۔ جھیل کے موٹے طور پر تین کنارے تھے۔ ایک جانب پشتہ اور پل تھا جدھر ہم تھے، دیگر دونوں کنارے دونوں جانب پھیلے ہوئے تھے۔

جیسے ہی ہم انجیر کے درخت کے نزدیک پہنچے اس پر سے ایک خوبصورت رام چڑیا (کنگ فشر) درخت سے اڑ کر فضا میں بلند ہوا۔ یہ سفید سینے والا پرندہ ہے جو اس علاقے میں عام طور پر ملتا ہے۔ اس پرندے کا نام اس کے مخصوص رنگ کی وجہ سے پڑا ہے۔ ہم اسے دیکھتے رہے۔ جوزف چلایا، پانی کے اوپر دیکھو۔ وہ ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے اس جانب دیکھا جدھر اس نے اشارہ کیا تھا اور ایک دلچسپ منظر دیکھا۔

پانی سے تقریباً 30 فٹ بلندی پر فضا میں ایک رام چڑیا (کنگ فشر) چکر لگا رہی تھی۔ یہ چتکبرا رنگ لیے ہوئے دھاری دار پرندہ تھا۔ یہ بڑی تیزی سے اپنے بازوؤں کو گردش دیتا ہوا ایک ہی جگہ معلق تھا اور اس کی نظر نیچے پانی پر تھی شکار کے لیے۔ ہماری نظریں اس پر ٹھہری ہوئی تھیں کہ اچانک اس نے اپنے بازو سمیٹ لیے اور کسی پتھر کے ٹکڑے کی طرح پانی پر جھٹکے سے گرا۔ فوراً وہ جھیل سے برآمد ہوا۔ اس کی چونچ میں کوئی چیز دبی ہوئی تھی۔ اب وہ خوشی سے بھری ہوئی آواز نکال رہا تھا اور درخت پر جا بیٹھا۔ اس کی چونچ میں ایک چھوٹی سی مچھلی دبی ہوئی تھی۔ اس نے شاخ پر اس مچھلی کو چند لمحوں تک الٹا پلٹا اور پھر نگل گیا۔

یہ رام چڑیا (کنگ فشر) سفید سینے والے کنگ فشر کا ہی بھائی بند تھا۔ اس دوپہر اور اس کے بعد بھی دیگر مواقع پر ہم اکثر اس کے دلچسپ شکار کے طریقے کو دیکھا کرتے تھے۔ اگرچہ اسے کم ہی کامیابی ملتی تھی اور اکثر وہ غوطے لگا کر ناکام ہی لوٹتا تھا تاہم اس وقت تک صبر کرتا جب تک اسے شکار نہ مل جاتا۔ ہم نے اس جھیل پر دیگر اقسام کے کنگ فشر بھی دیکھے۔ چھوٹا نیلا کنگ فشر اس کا قد گوریے کے قد سے مشابہ تھا۔

یہ پرندہ عادتاً ایسے درخت پر بیٹھتا تھا جو پانی کے نزدیک ہو اور اس پر نظر رکھتا تھا۔ معقول جواز پا کر یہ الیکٹرانک گھڑی کی سی آواز نکالتا ہوا جھیل کے پانی میں غوطہ لگاتا اور پھر اسی

قسط وار ناول

شاخ پر واپس آجاتا تھا۔

ایک صبح ہم نے کالی ٹوپی والا یعنی کالے رنگ کے سر والا کنگ فشر دیکھا۔ یہ پرندہ اوپر گہرا نیلا اور نیچے سے زرد مائل بھورا تھا۔ چونچ گہری سرخ۔ اس کے سر پر چوٹی نما پر بھی تھے۔ کالے سر والا کنگ فشر پایا جانا اس علاقے میں انوکھی بات تھی کیونکہ اس نسل کے کنگ فشر صرف سمندر کے علاقوں میں ہی پائے جاتے ہیں۔ یہ نمکین یا کھارے پانی کے نزدیک رہنا پسند کرتا ہے اور عام طور پر جس دریا یا سمندر کے نزدیک رہ رہا ہوتا ہے وہ اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ کم ہی جاتا ہے۔ چونکہ یہ جھیل سمندر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور یہاں کا پانی بھی میٹھا تھا، کنگ فشر کا یہاں دیکھا جانا بڑی سنسنی خیز تجربہ تھا۔

سفید رنگ کے سینے والے کنگ فشر کو چھوڑ کر تقریباً تمام طرح کے کنگ فشر اپنی خوراک کے لیے پانی کے ذخیرے پر انحصار کرتے ہیں۔ مچھلیاں، کیکڑے، مینڈک کے بچے، مینڈک اور پانی کے دوسرے کیڑے مکوڑے ان کی غذا ہیں۔ سفید رنگ کے سینے والا کنگ فشر خوراک کے لیے پانی کے ذخیرے پر بہت کم انحصار کرتا ہے۔ اس کی غذا میں چھپکلیاں ٹڈے اور دیگر کیڑے مکوڑے شامل ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ چوہے اور چھوٹی چڑیوں کا بھی شکار کر لیتا ہے۔ یہ اکثر پانی سے کسی ٹیلی گراف کے تار، اس کے کھمبے یا درخت پر خاموشی سے بیٹھا ہوا دیکھا جاسکتا ہے جہاں یہ اپنے شکار پر جھپٹ پڑنے کے لیے مستعد رہتا ہے۔

ہم جس جگہ کھڑے ہو کر اس منفرد کنگ فشر کو دیکھ رہے تھے وہیں چند روز کے بعد ایک دلچسپ واقعہ بھی ہوا۔

ایک شام میں یہاں اپنے کیمرے سمیت موجود تھا۔ مجھے توقع تھی کہ میں اس منفرد کنگ فشر اور جھیل کے کچھ نادر قسم کے فوٹو لے سکوں گا۔ اس وقت پانی میں بڑی ہلچل تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مچھلیاں پانی سے اچھلتیں۔ پانی میں بلبلے اور لہریں دیکھی جاسکتی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پانی کے اندر کوئی آبی مخلوق یقینی طور پر موجود ہے۔

خود پانی کا رنگ سبز مائل تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ آبی نباتات کثرت سے موجود ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ آبی مخلوقات بھی ہوگی۔

میری نظریں پانی پر جمی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ پانی کی سطح کے نیچے کوئی لمبی اور سفیدی شے میری جانب تیرتی ہوئی بڑھ رہی ہے۔ یہ میرے نزدیک تر آتی گئی۔ اب میں نے جو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک سانپ ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ کوئی بھی سانپ چھیڑے جانے پر ہی حملہ آور ہوتا ہے اور یہ کہ اگر میں خاموش رہا اور میں نے کوئی حرکت نہ کی تو میں بہت نزدیک سے اس کا مشاہدہ کرسکوں گا، تاہم سانپ کا سر بہت بڑا تھا۔ میں نے فوراً نتیجہ نکالا کہ ہو نہ ہو یہ ناگ ہے۔ اچانک مجھ پر خوف کا حملہ ہوا اور میں بھاگنے کی نیت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میری حرکت نے سانپ کو میری موجودگی سے باخبر کر دیا وہ قدرے جھجکا بھی۔ تاہم یہ جزوی طور پر پانی سے باہر نکل آیا۔ اب اس کے پھولے ہوئے سر کا راز بھی ظاہر ہوگیا۔ یہ ناگ نہیں تھا۔ یہ کوئی آبی سانپ تھا اور اس نے ایک مچھلی پکڑ رکھی تھی جو جزوی طور پر اس نے نگل بھی لی تھی۔

(جاری)

ماخذ: شہر میں ایک جنگل، **مصنف:** کمارن ست سیوم،
مترجم: عباس آصف، **مصور:** بی جی ورما،
ناشران: چلڈرن بک ٹرسٹ،
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، بچوں کا ادبی ٹرسٹ

نوید اختر پروانہ برھانپوری

گھر واپسی

عامر کی گرمی کی چھٹیاں ختم ہونے میں اب بس چند روز باقی تھے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی وہ چھٹیاں گزارنے کے لیے اپنی نانی کے ہاں مرزا پور آیا ہوا تھا۔ اور اب واپس اپنے گھر جانے کی تیاریوں میں جٹا ہوا تھا۔ وہ اپنے گھر واپس جانے کی تیاری کرتے ہوئے بہت زیادہ خوش تھا کیونکہ ان چھٹیوں میں اس نے اپنے گھر کو بہت یاد کیا تھا۔ اسے دادا ابو اور دادی امی بہت یاد آئے تھے۔ اور اب وہ خوش تھا کہ جلد ہی وہ اپنے گھر پر ہوگا۔

آخر کار عامر اپنی فیملی کے ساتھ مرزا پور ریلوے اسٹیشن جا پہنچا جہاں سے اسے اپنے شہر جانے والی ریل گاڑی میں سوار ہونا تھا۔ عامر کے ابو نے ٹکٹ خریدا اور پھر عامر اپنے اہل خانہ کے ساتھ ٹرین میں سوار ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹرین عامر کے شہر کی جانب چل پڑی۔ عامر کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ٹرین جب بھی کسی اسٹیشن پر رکتی عامر فوراً اپنے ابو کی طرف دیکھتا اور کہتا: ''ابو کیا ہمارا اسٹیشن آ گیا؟'' عامر کے ابو اسے دلاسہ دیتے تو وہ خاموش ہوجاتا اور چمکتی آنکھوں سے کھڑکی کے باہر تکتا رہتا۔ آخر وہ وقت آ ہی گیا جب عامر کے ابو نے اس سے کہا: ''چلو عامر ہمارا اسٹیشن آ گیا۔'' عامر اور اس کی گھر والے ٹرین سے اترے اور ٹیکسی میں سوار ہوگئے چند ہی منٹوں بعد ٹیکسی عامر کے گھر کے سامنے رک گئی جب سارے لوگ ٹیکسی سے اتر گئے۔ عامر اترتے ہی دوڑتے ہوئے گھر میں گھس گیا۔ جب سب لوگ اندر داخل ہوئے تو عامر وہاں نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد عامر ہال میں آیا تو اس کے دادا نے اس سے پوچھا: ''گھر میں آتے ہی کہاں چلے گئے تھے عامر بیٹا؟'' عامر بڑی سادگی سے بولا: ''دادا ابو! جب میں نانی کے ہاں تھا تب مجھے اپنے گھر کی بہت یاد آتی تھی۔ اب میں اپنے گھر پر ہوں تو بہت خوش ہوں۔ اس لیے میں اپنے طوطے کے پاس گیا تھا۔ اسے بھی اپنے گھر کی یاد آتی ہوگی، وہ بھی اپنے رشتے داروں کو یاد کرتا ہوگا، میں اس کا پنجرہ کھول آیا ہوں تاکہ وہ اپنے گھر واپس جاسکے اور اپنے رشتے داروں کے ساتھ خوشی خوشی رہ سکے۔'' عامر کی بات سن کر اس کے دادا سمیت گھر کے سبھی لوگ بہت خوش ہوئے اور سب نے عامر کو خوب شاباشی دی۔

■

Naved Akhtar Parwana Burhanpuri
Ghazi Salar Maidan, Momin Pura
Burhanpur (Madhya Pardesh)

فیاض احمد

ہند کی بیٹی : متانگینی ہاجرہ

73 برس کی ایک بوڑھی عورت جس کے جسم میں شاید اتنی طاقت بھی نہ ہوگی کہ وہ اپنا کام خود کرلے مگر نہ جانے اس عورت میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی کہ اکیلے ہی بندوقوں سے لیس انگریزی فوج کے سامنے سینہ تانے کھڑی ہوگئی اور اپنے وطن کے لیے اپنی جان قربان کردی۔ وہ جانباز عورت تھی مغربی بنگال کے ایک چھوٹے سے علاقے تملوک کی متانگینی ہاجرہ جس کا نام بھی بہت سے لوگوں نے آج اس کتاب میں ہی پڑھا ہوگا۔ ایسی ہزاروں عورتوں کی قربانیاں آج تاریخ کے صفحات میں آنسو بہا رہی ہیں کہ انھیں یاد کرنے والا کوئی نہیں۔

بہت افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والی ان بہادر اور جانباز عورتوں کو تاریخ دانوں نے بھی نظر انداز کیا اور ان کا ذکر برائے نام ہی کیا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں نے بھی کاندھے سے کاندھا ملا کر حصہ لیا تھا اور بہتوں نے تو اپنی جانیں تک قربان کردی تھیں۔ یوں تو ان کی تعداد ہزاروں میں ہوگی مگر ان عورتوں میں جو پیش پیش رہیں ان میں چند کے نام ہیں: رانی لکشمی بائی، متانگینی ہاجرہ، کستوربا گاندھی، بیگم حضرت محل، اینی بسنٹ، سروجنی نائیڈو وغیرہ۔ آج ہم ان بہادر اور نڈر عورتوں میں سے خصوصاً متانگینی ہاجرہ کے بہادری کے کارناموں کو یاد کریں گے۔

متانگینی ہاجرہ (1870-1942) ایک غریب کسان کی بیٹی تھیں۔ ہندوستان کی آزادی ان کو بہت پیاری تھی، لہٰذا انھوں نے 1905 سے جنگ آزادی میں حصہ لینا شروع کردیا۔ جب گاندھی جی نے سیول نافرمانی تحریک چلائی تو یہ بھی اس میں شامل تھیں اور جیل بھی گئیں۔ یہ گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد کی حمایتی تھیں اور خود چرخہ چلا کر سوت کات کر

کھادی کی ساڑی پہنا کرتی تھیں۔ ان کی ہمت اور عزم بھی گاندھی جی سے کم نہ تھے۔ ان سبھی خوبیوں کی وجہ سے لوگوں نے انھیں گاندھی بوڑھی (بوڑھی خاتون گاندھی) کا نام دے دیا تھا۔ یہ وہ جانباز عورت تھی جن کی زبان پر آخری سانس تک ہندوستان کا نام تھا۔

بھارت چھوڑو تحریک کے تحت جب تملوک کے کانگریس کے ممبران نے انگریزوں کو کھدیڑنے کی غرض سے علاقے کے تھانے پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا تو متانگینی ہاجرہ نے 29 ستمبر 1942 کو جب کہ ان کی عمر 73 برس تھی اپنی چھ ہزار ساتھیوں کو لے کر تملوک (مغربی بنگال) پولس تھانہ کی طرف بڑھیں۔ اس وقت دفعہ 144 لگی ہوئی تھی اور جلسے جلوس پر پابندی تھی۔ مظاہرے کے دوران انگریزوں نے ان پر ایک گولی چلائی اور پیچھے ہٹنے کو کہا۔ آپ نے لوگوں پر گولیاں نہ چلانے کی گزارش کی اور اکیلے آگے بڑھتی رہیں۔ انگریزوں نے گولیاں جاری رکھیں اور کئی لوگ مارے گئے۔ متانگینی ہاجرہ پر تین گولیاں چلائی گئیں مگر وہ پیچھے نہیں ہٹیں اور آخری سانس تک بندے ماترم کہتی ہوئیں شہید ہوگئیں۔ کہا جاتا ہے کہ آخری دم تک انھوں نے ترنگے کو اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا۔ تاریخ کے صفحات پر ایسے کئی واقعات بکھرے پڑے ہیں۔

اِس قربانی کے بعد پورے علاقے کے لوگوں میں اتنا جوش بھر گیا کہ انھوں نے انگریزوں کو کھدیڑ کر وہاں خودمختار حکومت قائم کردی جو 21 مہینے تک چلی۔

■

Faiyaz Ahmad
South Bazar, P.O: Andal
Distt: Paschim Bardhaman - 713321 (W.B)

ہماری ٹیچر

اچھی باتیں..... سچی باتیں
روز بتاتی ہیں ہم کو
کھیل کھلاتی ہیں ہم کو
کتنی پیاری ٹیچر ہیں
آپ ہماری ٹیچر ہیں
لکھنا پڑھنا..... آگے بڑھنا
آپ سکھاتی ہیں ہم کو
نیک بناتی ہیں ہم کو
کتنی پیاری ٹیچر ہیں
آپ ہماری ٹیچر ہیں

■

Shumyla Tanzil Mohammad Rafique
Urdu Primary Saifiyah
School Paradise Colony
Amravati (Maharashtra)

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

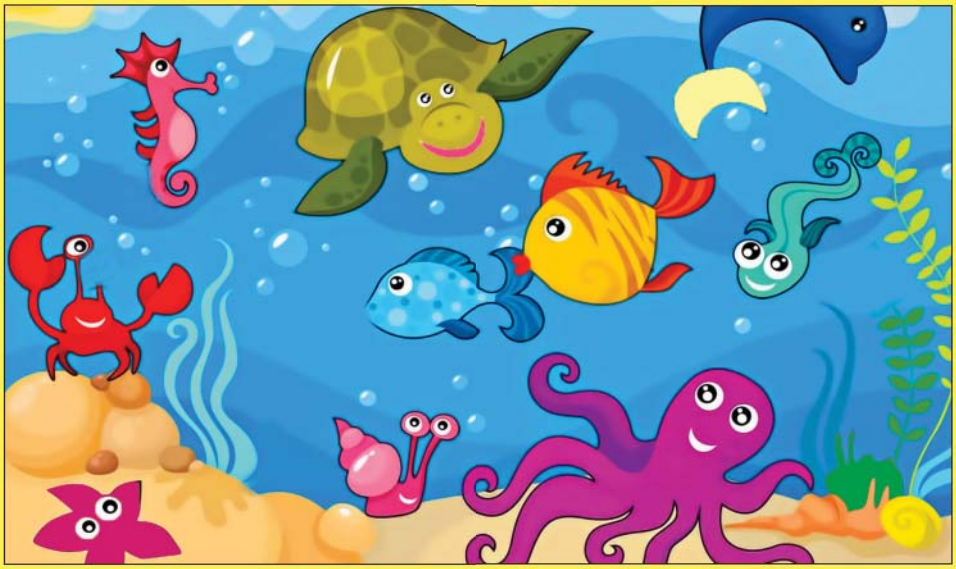

■ جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں

ہنسی کے غبارے

باپ (کاشف سے) ''بیٹے! تم نے سارے مضامین میں انڈا لیا ہے، جب میں تمھاری عمر کا تھا تو کلاس میں فرسٹ آیا کرتا تھا۔''

کاشف ''لیکن ابو یہ تو آپ ہی کی رپورٹ ہے جو مجھے آپ کی الماری سے ملی ہے۔''

گاہک (دکان دار سے) ''اس سوٹ کی کیا قیمت ہے؟''

دکان دار ''پانچ سو روپے''

قیمت سن کر گاہک پریشان ہوگیا۔ سوٹ اسے پسند تھا لیکن قیمت سن کر وہ ڈر گیا۔ دکان دار نے زرد رنگ کا سوٹ دکھایا اور کہا ''یہ دیکھیے بڑا پیارا کپڑا ہے، اس کا رنگ آپ کے رنگ سے میچ کرتا ہے۔''

گاہک بولا ''تمھیں کیا پتہ کہ میرے چہرے کا موجود رنگ ہی اصلی اور مستقل ہے؟''

دکان دار نے حیرت سے کہا ''تو کیا یہ آپ کے چہرے کا اصلی رنگ نہیں ہے؟''

''نہیں! یہ تو سوٹ کی قیمت سن کر ہوا ہے۔'' گاہک نے جواب دیا۔

ایک ملک کے انتہائی ظالم حکمراں نے ہیلی کاپٹر میں سفر کرتے ہوئے سوچا کہ عوام مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ایک وزیر سے کہا ''کیوں نہ میں ایک سو روپے کا ایک نوٹ نیچے پھینکوں جس کے ہاتھ لگے گا کم از کم وہ تو مجھ سے خوش ہوگا۔''

پھر اپنے خیال کی تردید کرتا ہوا بولا ''نہیں، میں پچاس پچاس کے دو نوٹ پھینکتا ہوں، اس طرح دو آدمی خوش ہوجائیں گے۔''

وزیر بولا ''جی ہاں۔''

حاکم نے کہا ''نہیں، دس دس کے دس نوٹ یا پانچ پانچ کے بیس نوٹ پھینکتا ہوں، بیس آدمی خوش ہوں گے۔''

وزیر نے سر ہلا کر کہا ''جی ہاں! یہ بات تو ہے۔''

حاکم بولا ''نہیں، ایک ایک روپے کے سو نوٹ پھینکتا ہوں تاکہ سو آدمی مجھ سے خوش ہوں۔''

وزیر نے جل کر کہا ''جناب! آپ خود ہی چھلانگ لگا دیں، پوری قوم خوش ہوجائے گی۔''

خاتون (نوکر سے) ''تمھیں کس گدھے نے نوکر رکھا ہے؟''

نوکر ''بیگم صاحبہ! صاحب جی نے رکھا ہے۔''

عائشہ آفرین عبدالرؤف

ننھے فنکار

انصاف کی پکار

بہت پرانے زمانے کی بات ہے۔ اس وقت بادشاہوں کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ بادشاہ ہی انصاف کرتے تھے۔ آج کل کی طرح اس زمانے میں کورٹ نہ تھے، نہ وکیل اور نہ جج۔ بادشاہ ہی جج کے فرائض انجام دیا کرتے اور وہی انصاف بھی کرتے تھے۔ تو بچو! ایسے ہی زمانے کی یہ کہانی ہے۔

ایک گاؤں میں دو دوست رہتے تھے۔ امجد اور حامد۔ دونوں کے گھر بھی پاس پاس تھے۔ اسی لیے ان میں دوستی بھی گہری تھی۔ امجد بہت ہی غریب تھا جبکہ حامد کافی دولت مند تھا مگر پھر بھی وہ گہرے دوست تھے۔

امجد غریب تھا ضرور مگر خوش مزاج اور ملنسار تھا۔ اس کی بیوی بھی خوش اخلاق اور گھل مل کر رہنے والی تھی۔ امجد کی تھوڑی سی کھیتی تھی جس پر وہ خوب محنت کرتا اور اپنے چھوٹے سے کنبے کا پیٹ پالتا تھا۔ اس کی دو چھوٹی چھوٹی بیٹیاں بھی تھیں۔

ایک دن امجد کی بیوی نے اس سے کہا ''اپنی مالی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ سالوں بعد ہماری لڑکیاں شادی کے لائق ہو جائیں گی ان کے لیے زیورات اور شادی بیاہ کے خرچ کے لیے روپوں کی ضرورت پڑے گی۔ ہمیں ابھی سے تھوڑی تھوڑی بچت کر کے روپے جمع کرنے ہوں گے تاکہ زیورات وغیرہ بنوا کر رکھ لیں۔''

امجد کو اپنی بیوی کی رائے پسند آئی۔ اب انھوں نے بچت کرنی شروع کر دی اور کچھ روپے اکٹھے ہونے کے بعد انھوں نے کچھ زیور بنوائے مگر اب مسئلہ ان زیورات کو رکھنے کا تھا۔

ننھے فنکار

ان کے گھر میں ایسی کوئی الماری وغیرہ نہیں تھی جس میں انھیں محفوظ رکھ سکیں۔ امجد کو ایک ترکیب سوجھی کہ کیوں نہ یہ زیورات حامد کے گھر کی تجوری میں رکھوادیں۔ وہ پڑوسی بھی ہے اور دوست ہونے کے علاوہ بھروسے مند بھی ہے۔ اس کی بیوی کو بھی یہ بات پسند آئی۔ اس لیے امجد ایک گٹھری میں زیورات باندھ کر حامد کے گھر لے گیا اور بولا ''دوست یہ زیورات ہم نے پائی پائی جوڑ کر اپنی لڑکیوں کے لیے بنوائے ہیں لیکن ہمارا گھر ایسا نہیں ہے جس میں یہ محفوظ رکھے رہیں۔ کیا تم ان کو اپنی تجوری میں حفاظت سے رکھ سکتے ہو؟ جب شادی کا وقت آئے گا تو لے لوں گا۔''

حامد نے کہا ''دوست کی مدد کرنا تو دوست کا فرض ہوتا ہے۔ اب تو بے فکر ہوجا۔ تیرے سامنے ہی انھیں تجوری میں رکھتا ہوں۔ تو نے دھیان سے تو دیکھ لیا ہے کہ کون کون سے زیورات ہیں؟

امجد کے بتانے پر حامد نے زیورات تجوری میں رکھ دیے اسی طرح امجد اور اس کی بیوی اب بے فکر ہوگئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے بارہ برس گزر گئے۔ امجد کی دونوں لڑکیاں بڑی ہوچکی تھیں۔ کچھ دنوں بعد ان کی شادی بھی طے ہوگئی۔ اتفاق کی بات کہ دونوں کی شادی ایک ہی دن ہونا طے پائی۔ امجد نے باقی انتظامات بھی کرلیے پھر زیورات لینے کے لیے وہ حامد کے گھر گیا اور بولا۔

''دوست! تم نے میرے زیورات کی بارہ برس تک حفاظت کی۔ میں تمھارا بہت احسان مند ہوں۔ جیسا کہ تمھیں معلوم ہے لڑکیوں کی شادی ہونے والی ہے اس لیے میں وہ زیورات لینے آیا ہوں۔''

مگر اب حامد کی نیت بدل چکی تھی۔ اس نے تعجب سے کہا ''تو کیا کہہ رہا ہے میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کون سے زیورات؟ میں نے تیرے زیورات دیکھے تک نہیں تو رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

پہلے تو امجد یہ سمجھا کہ دوست مذاق کررہا ہے، ہنس کر بولا: مذاق بعد میں کرلینا پہلے زیورات تو دے دو۔''

اس پر حامد بولا: ''توبہ توبہ، میں مذاق کیوں کرنے لگا۔ تو نے میرے پاس زیورات رکھے ہی کب تھے جو میں انھیں واپس کردوں تو پاگل تو نہیں ہوگیا۔''

امجد نے حامد کو بہت سمجھایا۔ بہت یاد دلایا کہ فلاں دن میں زیورات لے کر تیرے پاس آیا تھا اور ہم دونوں میں کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔ خدا اور رسول کا واسطہ بھی دیا۔ قسمیں کھائیں مگر حامد صاف مکر گیا اور امجد کو ڈانٹ ڈپٹ کر اپنے گھر سے نکال دیا۔

گھر آکر اس نے ساری باتیں بیوی کو بتائیں۔ اُسے بھی حامد سے یہ امید نہیں تھی۔ اسے بھی بہت دکھ ہوا۔ مگر مسئلہ تو زیورات کا تھا۔ شادی میں کچھ ہی دن رہ گئے تھے۔ دوبارہ زیورات بنوانا ان کے بس میں نہ تھا اس لیے دونوں نے بادشاہ کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔

دربار پہنچ کر دونوں نے بادشاہ کو ساری باتیں تفصیل سے بتائیں اور کہا کہ اب آپ ہی ہمیں انصاف دلا سکتے ہیں۔

بادشاہ نے حامد کو بلوایا اور اس سے زیورات کے بارے میں پوچھا مگر وہ بادشاہ کے سامنے بھی صاف مُکر گیا۔ اب بادشاہ نے اس سے کہا کہ کل وہ اپنی بیوی کے ساتھ دربار میں آئے۔

دوسرے دن، حامد، امجد اور ان کی بیویاں بھی دربار میں آئے۔ بادشاہ نے ان چاروں سے کہا تمھارے سامنے ایک

ایک ڈولی رکھی ہے۔ اس کے اندر ایک بھاری پتھر بھی رکھا ہے۔ تم چاروں اپنی اپنی ڈولیاں اٹھا کر اس میدان کا ایک چکر لگاؤ۔ مگر خبردار، اندر جھانکنے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر کسی نے بھی تمھیں اندر جھانکتے ہوئے دیکھ لیا تو سخت سے سخت سزا ملے گی۔

پہلے امجد اور اس کی بیوی نے ڈولی اٹھا کر چلنا شروع کیا۔ ایک طرف سے امجد نے پکڑا اور دوسری طرف سے اس کی بیوی نے۔ ڈولی بہت زیادہ بھاری تھی۔ تھوڑی ہی دور جا کر دونوں ہانپنے لگے۔ امجد بولا:

اے اللہ! یہ کیا مصیبت تو نے ہماری قسمت میں لکھ دی ہے۔ پہلے میرے دوست نے مجھے دھوکا دے کر میری محنت کی کمائی کے زیورات لے لیے اور اب یہ نئی مصیبت۔

اس پر اس کی بیوی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا آپ خدا پر بھروسہ رکھیں۔ وہی ہمارے ساتھ انصاف کرے گا۔ سچ کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔ آپ صبر سے کام لیں۔

دونوں نے جیسے تیسے چکر پورا کیا اور واپس آ کر ڈولی رکھ دی۔ اس کے بعد حامد اور اس کی بیوی نے اپنی ڈولی اٹھائی اور چلنا شروع کیا۔ ڈولی وزنی تھی۔ غصے سے حامد کی بیوی بولی تم کیوں بلاوجہ اتنے لالچی ہو گئے اور زیورات کے لیے مکر گئے۔

ہمارے پاس کیا کمی ہے زیورات کی۔ تم نے لالچ میں اپنے دوست کو بھی دھوکا دیا۔

اس پر حامد ہنسنے لگا اور بولا۔ اری پیاری بیوی! یہ سب میں نے تیرے ہی لیے تو کیا ہے پھر بھی تو مجھ ہی پر غصہ کر رہی ہے۔ مانا کہ ڈولی وزنی ہے مگر ایک چکر پورا ہو گیا تو وہ سب زیورات تیرے ہو جائیں گے۔ کتنے خوبصورت زیورات ہیں تو نے تو دیکھے ہیں نا۔ اب جلدی جلدی چل۔

اس طرح ان دونوں نے بھی چکر پورا کر کے ڈولی واپس لا کر رکھ دی۔ اور ہانپتے ہوئے پسینہ پوچھنے لگے۔

بادشاہ اپنے تخت سے اٹھ کر ڈولی کے پاس آیا اور زور سے بولا ''چلو باہر نکلو۔''

دونوں ڈولیوں میں سے ایک ایک آدمی ہاتھ میں قلم اور کاغذ لیے نکلے۔ سب لوگ حیران رہ گئے کیونکہ کہا گیا تھا کہ ان ڈولیوں میں وزنی پتھر ہے مگر اصل میں بادشاہ نے انھیں چاروں کی باتیں لکھنے کے لیے ڈولی میں چھپایا تھا۔ انھوں نے اپنے اپنے کاغذ بادشاہ کے حوالے کر دیے۔ بادشاہ نے اسے وزیر کو دیا اور زور سے پڑھنے کا حکم دیا۔ وزیر نے باری باری چاروں کی بات پڑھ کر سنا دی۔ جیسے جیسے وہ پڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے حامد اور اس کی بیوی مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ جب وزیر بیان سنا چکا تو حقیقت سب کے سامنے آ گئی۔ آخر میں بادشاہ نے فرمان جاری کیا۔

حامد ایک جھوٹا، بے ایمان، بددیانتی اور مکار آدمی ہے اور خود کو ہمارا قیدی سمجھے اور ہمارے سپاہیوں کے ساتھ جا کر امجد کے زیورات واپس کرے۔ بے ایمانی کے بدلے اسے دو برس جیل کی سزا دی جاتی ہے۔

اس طرح امجد کی محنت کی کمائی کے زیورات اسے واپس مل گئے۔ بادشاہ کے انصاف نے ایک پیچیدہ مسئلے کو سلجھا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔

■

Aisha Afreen Abdur Rauf
Class: VIII-A
Anjuman Anwarul Islam
High School, Balapur,Akola (Maharashtra)

محمد تنویر

ننھے فنکار

مینڈک کی دنیا

قدرت نے نباتات، جمادات اور حیوانات کو کئی موسم عطا کیے ہیں۔ ان موسموں میں جانداروں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ جس طرح بہار کے موسم میں پیڑ پودے، پھول، پھل اور دیگر نباتات زمین سے سر اٹھاتے ہیں۔ دنیا کو ہرا بھرا کرتے ہیں۔ اسی طرح برسات کے موسم میں مینڈک کو دیکھا جاتا ہے۔ اس کی دنیا موسمی دنیا ہوتی ہے۔ بارش کا موسم آتا ہے تو وہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے اور قدرت کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ بارش ایک نعمت بن کر میرے لیے آئی ہے۔ جب تک بارش کا موسم رہتا ہے۔ مختلف اقسام کے مینڈک میدانوں میں، کھیتوں میں اور تالابوں میں نظر آتے ہیں۔ خصوصاً جہاں بارش کا پانی جم جاتا ہے وہاں مینڈک کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ مینڈک خدا کا شکریہ ادا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''ہمیں اتنی اچھی نعمت ملی ہے کہ ہم آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ خدا اس موسم میں کھانے، پینے کا معقول بند و بست کرتا ہے اور ہمیں رات بھر گانا گانے کی صلاحیت بخشتا ہے۔''

بارش مینڈکوں کے لیے ایک سنہرا اور انمول پیغام فراہم کرتا ہے جس کی بنا پر مینڈک اپنی زندگی حسن و خوبی کے ساتھ گزارتا ہے پھر نہ جانے وہ کہاں غائب ہوجاتا ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مینڈک کی دنیا سے ایک الگ دنیا بخشی ہے۔ ہمیں ہر موسم میں زندہ رہنے، چلنے، پھرنے کی سہولتیں فراہم کی ہیں اور ہم برسوں اس موسم سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ یہ شانِ کریمی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

مینڈک کی دنیا قابلِ نصیحت ہے۔ برسات میں اس کی پیدائش ہوتی ہے۔ جب برسات ختم ہوجاتی ہے تو بمشکل اِکّا دُکّا مینڈک نظر آتے ہیں۔ اتنی کم زندگی حاصل کرنے کے باوجود وہ اپنے رب کو بھولتا نہیں، اس کا شکر گزار ہوتا ہے۔ انسان کیسا ناشکر گزار بندہ ہے کہ وہ اپنے پالنہار کو بھولے سے بھی یاد نہیں کرتا ہے۔ وہ عیش و عشرت کی زندگی میں مصروف رہتا ہے۔

■

Mohd Tanveer
Hameed Nagar
Burhanpur - 450445 (MP)

ننھے فنکار

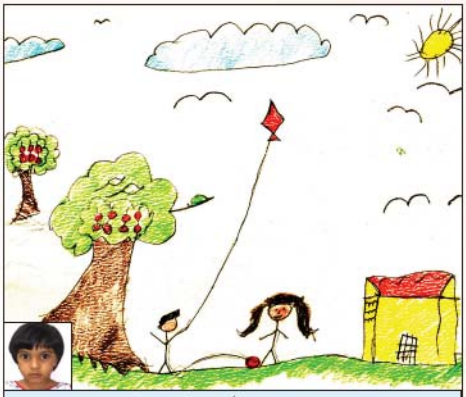

حمنہ فاطمہ، درجہ کے جی 2، ہیریٹج پبلک اسکول، ناگپور، مہاراشٹر

ثنا فاطمہ معراج الدین انصاری، درجہ ہشتم، محمد شریف سوداگر ہائی اسکول، دیسائی گنج وڈسا، ضلع گڑھ چرولی، مہاراشٹر

امیمہ کاشف، درجہ ہشتم، اردو ہائی اسکول، ورود، مہاراشٹر

سیدہ جویریہ ایمن رضوان، درجہ ہفتم، ملیہ گرلس ہائی اسکول، مہاراشٹر

مدیحہ مسکان عمر دراز حسین، درجہ: ہفتم، زیڈ پی اپر پرائمری اسکول
پوسٹ: چندور بازار، ضلع: امراوتی، مہاراشٹر

مومن عالیہ فردوس ریاض احمد، درجہ ششم، زیڈ پی اردو اسکول نمبر 3، چوپڑہ، جلگاؤں، مہاراشٹر

ننھے فنکار

سیدہ اریبہ نایاب سید منیر الدین، درجہ: نہم فاطمہ گرلس اردو ہائی اسکول
بیگم پورہ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

سیدہ رمیصاء تنعیم سید وزیر، درجہ: نہم، فاطمہ گرلس اردو ہائی اسکول، بیگم پورہ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

رمیشہ شین محمد علیم، درجہ چہارم، نگر پریشد اردو مڈل اسکول، ناندورہ، مہاراشٹر

عفیر احمد علی قریشی، درجہ: ہشتم نیشنل اردو گرلس ہائی اسکول، نندر بار، مہاراشٹر

مومن طوبیٰ شفیق احمد، درجہ: ششم، مدرسہ عائشہؓ ہائی اسکول، مالیگاؤں، مہاراشٹر

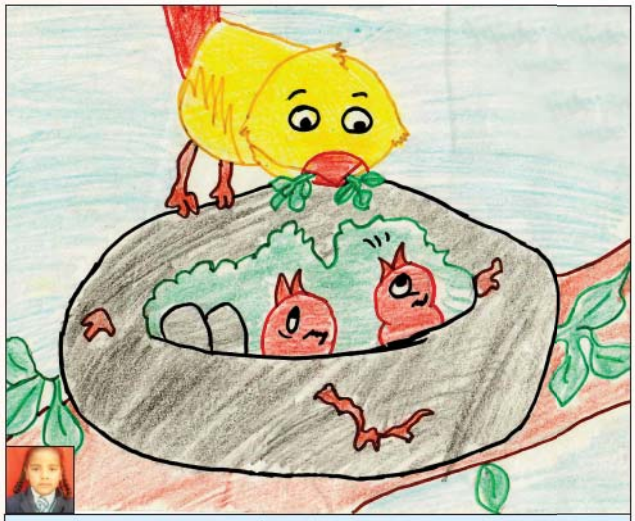

شاذ دیپ، درجہ: چہارم (بی)، سنوے اسکول، رامپور، یوپی

اردو فیس بک facebook

انکل میرا نام الصبا ارم ہے۔ میں جماعت دہم (الف) کی طالبہ ہوں۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی اس رسالے کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ اسکول کے بہت سے طلبا اس رسالے کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ میری والدہ کو اس میں موجود اچھی اچھی باتیں، خوشبو بھری باتیں اور اقوال زریں بہت پسند ہیں۔

الصباء ارم، اصلاح البنات، اردو گرلز ہائی اسکول، دھولیہ، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' کا تازہ شمارہ سیفی لائبریری میں دیکھا۔ اتنا خوبصورت اور معیاری رسالہ دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ آپ کا اداریہ بے حد پسند آیا۔ 'بچوں کی دنیا' بہت پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ بچوں کی نفسیات سے متعلق سبھی مضامین بہت ہی لاجواب ہیں۔ جس انداز کی کہانیاں 'بچوں کی دنیا' میں شائع ہوتی ہیں وہ ہم جیسے طالب علم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ تازہ شمارے میں 15 اگست سے متعلق سبھی کہانیاں بہت معلوماتی ہیں، سب سے اچھی کہانی 'آزادی کی قیمت' اور 'پانی کی کہانی' لگی۔

استوتی اگروال، اگروال جیولرز، سرونج، مدھیہ پردیش

مجھے 'بچوں کی دنیا' بہت پسند ہے۔ مجھے اس کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ میں درجہ سوم کی طالبہ ہوں۔

شمائلہ تنزیل محمد رفیق، اردو پرائمری سیفیہ اسکول، امراوتی، مہاراشٹر

میرا نام شیخ عامر ارشاد ہے۔ 'بچوں کی دنیا' میں پہلی بار حاضر ہوں، میرے گھر والوں کو ہر ماہ 'بچوں کی دنیا' کا بہت انتظار رہتا ہے۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' میں 'کہانی' پڑھنا اور 'ننھے فنکار' بہت اچھا لگتا ہے۔

شیخ عامر ارشاد، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی

انکل جی! میرا نام صائم ارحم ہے۔ میں درجہ ہشتم کا طالب علم ہوں۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' بہت پسند ہے۔ میں شروع سے اس کا مطالعہ کررہا ہوں۔ میں ہر ماہ اس کا بے صبری سے انتظار کرتا ہوں۔ میں قسط وار ناول بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ قسط وار ناول 'زمین کی تہہ میں' بہت پسند آیا۔ میری امی کو یہ بات بہت پسند ہے کہ میں اس رسالے کا دلچسپی سے مطالعہ کرتا ہوں۔ مجھے بچپن سے کہانیاں لکھنے کا شوق ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس رسالے کے لیے اچھی سی کہانی لکھوں۔ کیا آپ شائع کریں گے؟

* کہانی اچھی ہوئی تو ضرور شائع کریں گے۔ (ادارہ)

صائم ارحم عقیل احمد، محمدیہ اردو بوائز ہائی اسکول، دھولیہ، مہاراشٹر

میں انصاری ثنا کوثر گذشتہ کئی ماہ سے 'بچوں کی دنیا' پابندی سے پڑھتی ہوں۔ اس میں مجھے بہت ساری معلومات ملتی ہیں، خاص کر سائنسی مضمون مجھے بہت پسند ہے۔ واقعی بچوں کی دنیا ہم سب طلبہ و طالبات کے لیے نایاب تحفہ ہے جو ہمیں ہر مہینے پابندی سے مل جاتا ہے۔

انصاری ثنا کوثر بنت عتیق الرحمٰن، نور جونیئر کالج آف آرٹس دھولیہ، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

صفحات (سیٹ):30+3923، قیمت (سیٹ):1935 روپے

صفحات: 411، قیمت: 185 روپے

صفحات: 619، قیمت: 275 روپے

صفحات: 315، قیمت: 155 روپے

صفحات: 129، قیمت: 85 روپے

صفحات: 260، قیمت: 145 روپے

صفحات: 326، قیمت: 155 روپے

صفحات: 546، قیمت: 230 روپے

صفحات: 196، قیمت: 110 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, October 2018, Vol. 06, Issue: 10
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/09/18
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

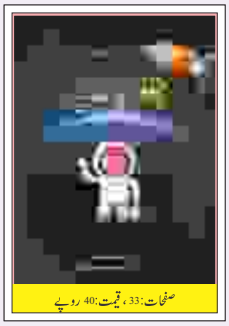
صفحات: 33، قیمت: 40 روپے

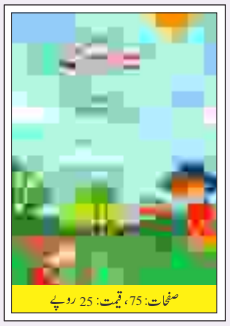
صفحات: 75، قیمت: 25 روپے

صفحات: 43، قیمت: 10 روپے

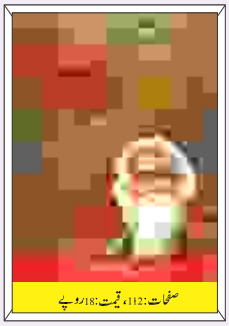
صفحات: 112، قیمت: 18 روپے

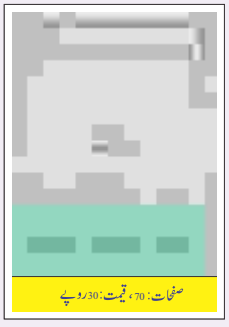
صفحات: 70، قیمت: 30 روپے

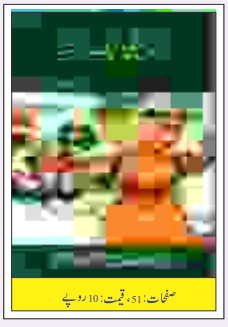
صفحات: 51، قیمت: 10 روپے

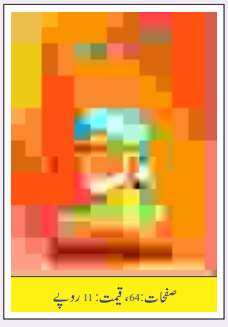
صفحات: 64، قیمت: 11 روپے

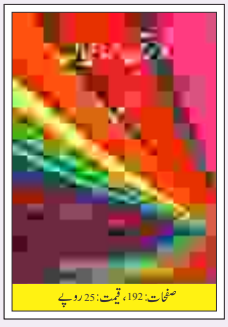
صفحات: 192، قیمت: 25 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.